ہفت روزہ
الفتح
کراچی
۱۲ — ۱۹ اگست ۱۹۷۱ء

اشاعتِ خاص
یومِ استقلال ۱۹۷۱ء

مسلم لیگ — پردہ چاک

شمالی ہشت نگر کے کسانوں پر کیا گذری ؟

مشرق و مغرب کے مظلوم ایک ہیں'



قیمت: — ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے — ۷۵ پیسے

زرعی ترقیاتی بینک پاکستان

بہتر زراعت کے ذریعہ قومی خوشحالی کا ضامن

زرعی ترقیاتی بینک پاکستان نے زرعی آلات اور جدید اصولوں سے استفادہ کی رفتار کو تیز تر کر کے ملک میں کاشتکاری کو فروغ دینے اور پیداوار بڑھانے میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔

زرعی ترقیاتی بینک ٹریکٹر، پاور ٹلر، پاور پمپ، ٹیوب ویل اور دوسرے زرعی آلات خریدنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضے دیتا ہے۔ وہ ماہی گیری اور چائے کی صنعت کی ترقی کے لئے قرضوں کی سہولتیں مہیا کرنے کے علاوہ بہتر بیج، کھاد اور کیڑے مار دواؤں کے لئے بھی سرمایہ فراہم کرتا ہے۔

بینک کاری کی تمام سہولتوں کے علاوہ جن میں کرنٹ اور سیونگ بینک اکاؤنٹ بھی شامل ہیں زرعی ترقیاتی بینک آپکی معیادی امانتوں پر دوسرے منظور شدہ بینکوں کے مقابلہ میں ایک فیصد زیادہ منافع دیتا ہے۔

مشرقی اور مغربی پاکستان میں ۱۷۴ سے زیادہ شاخیں :-



زرعی ترقیاتی بینک پاکستان

ہیڈ آفس :-
شفیع کورٹ۔ میری ویدر روڈ۔ کراچی











PRESTIGE A.D.B.P.102/8,70

الفتح

نئی نسل ۔ پرانی نسل سے پوچھتی ہے

۱۴ اگست ۱۹۷۱ء
۱۴ اگست ۱۹۴۷ء

۲۴ برس ——————— ؟

طویل، سنگین، خوفناک، المناک، تباہ کن، کٹھن ۲۴ برس۔ کچھ ہم ہی جانتے ہیں کہ یہ ۲۴ برس کیسے گذرے ہیں یا کیسے گھڑیاں گن گن کر گذارے ہیں۔ ہم جو اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو پاکستان کے ساتھ ساتھ جوان ہوئے ہیں۔ ہم جنہوں نے آنکھ پاکستان میں کھولی، ہوش پاکستان میں سنبھالا۔ پرورش پاکستان میں پائی، شعور پاکستان میں سنبھالا، ہم نے اگرچہ پاکستان کو حاصل نہیں کیا، لیکن پاکستان کو اس کی وجودی حیثیت میں عوام کی تمام تر قربانیوں، اقتصادی محرومیوں اور سیاسی جد وجہد سمیت قبول کیا۔ اس کی حدود کو اپنی جان سے عزیز تر، ہر شے سے مقدس تر سمجھتے ہوئے اس کی محبت کو اپنے دل اور دماغ میں لبسایا۔

ہم جب ہوش سنبھال رہے تھے، جب پاکستان ہوش سنبھال رہا تھا۔

ہم جب لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھ رہے تھے، جب پاکستان کی تاریخ ورق ورق آگے جا رہی تھی اس وقت وہ افراد۔ اس ملک کی تقدیر پر قابض تھے، جو قیام پاکستان کے دعویدار رہے جو تحریک پاکستان میں پیش پیش تھے۔ وہ ہماری پرانی نسل کے ہمعصر تھے۔ ہماری پرانی نسل نے ان بزرگوں اور رہنماؤں کے ساتھ مل کر یہ نیا خطہ، نیا ملک حاصل کیا تھا۔ اور ہم نے اس خطے اور ملک کو اپنا وطن سمجھ کر اپنایا، اپنا سب کچھ اس کے لئے وقف کر دیا۔ ہم نے آج تک اس نسل کے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔ گذشتہ ۲۴ برس تک انہوں نے جو کچھ چاہا انہیں کرنے دیا کیونکہ انہوں نے پاکستان کو حاصل کرنے کی جد وجہد میں حصہ لیا تھا۔ آج جب نئی نسل شعور حاصل کر چکی ہے۔

ہوش سنبھال چکی ہے۔

اپنی قوت اور اپنے حقوق سے آشنا ہو چکی ہے۔

اس وقت وہ پرانی نسل سے دو بدو سوال کرنا چاہتی ہے، پوچھنا چاہتی ہے، کیونکہ اب اس ملک کی تقدیر پر وہ اپنا حق سمجھتی ہے۔ پاکستان کی تاریخ کے نشیب و فراز نے پاکستان کے اصل مالک بارہ کروڑ عوام کی غربتوں اور کلفتوں نے، دنیا بھر میں مظلوموں کی ظالموں کے خلاف جد وجہد نے اس صورتحال میں پروان چڑھتی نئی نسل کو شعور کی جو روشنی بخشی ہے اسے اپنے سینے سے لگائے نئی نسل۔ پرانی نسل سے آمنا سامنا کر رہی ہے۔

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد: ۔ ۲ شمارہ: ۔ ۱۳

۱۲ ۔ ۱۹ اگست ۱۹۷۱ء

نگران
شوکت صدیقی
محمود شام

مدیر
ارشاد راؤ

معاونین خصوصی
ابراہیم جلیس، افضل صدیقی، عبدالحمید چھاپرا

مجلس ادارت
وہاب صدیقی ——— نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر
غلام نبی بزمی

بدل اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت: ۔ ۶۰ فلس دوبئی قطر: ۷۵ درہم
سعودی عرب: ۔ ۱۵ قرش ۔ انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۸۰ ڈی، نرسری کمرشل ایریا، پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس۔ کراچی ۔ ۲۹

ایڈیٹر پبلشر، ارشاد راؤ
مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد ۔ کراچی

آج پاکستان کے ۲۴ویں برس پر نئی نسل پرانی نسل سے پوچھتی ہے!

★ — پاکستان جن مقاصد کے لئے بھی بنایا گیا تھا، انہیں پورا کیوں نہیں کیا گیا، جبکہ ۲۴ برس سے پرانی نسل ہی پاکستان کی تقدیر پر قابض ہے

★ — ایک ایسی تحریک چلانے وقت، جس سے کروڑوں عوام کا مستقبل وابستہ تھا، کیا مستقبل کا کوئی خاکہ ترتیب نہیں دیا گیا تھا۔ کہ آج تک یہ سرزمین بے آئین ہے۔

★ — کیا سرحدوں پر دم توڑنے والے غریبوں، استحصالی معاشرے کی شکار ماؤں بہنوں کا خون اور گاڑیوں میں لاشوں کے ڈھیروں کی خوفناک یادنے بھی انہیں ۲۴ برس تک احساس کی رمق تک عطا نہیں کی۔

★ — ۲۴ برس میں آج تک کبھی اقتدار عوام کے ہاتھ میں آنے دیا گیا —؟

★ — ۲۴۔ برس میں آج تک کبھی اقتدار کی منتقلی نارمل حالات میں ہوئی —!

★ — پرانی نسل نے نئی نسل کو کیا ورثہ دیا۔ چند خاندانوں کے علاوہ بھوک افلاس، غربت، بیماری سے بلکتی کروڑوں روحیں۔ شہروں کی گلیوں اور سڑکوں پر پھرتے لاکھوں بے روزگار۔ ہر کس وناکس کے سامنے امداد کے لئے ہاتھ پھیلاتا ملک۔ دنیا بھر میں ذلت ورسوائی

★ — آج پنجاب، بنگال، سندھ، سرحد، بلوچستان میں رہنے والے مظلوموں کے درمیان نفرت کی دیواریں، کیوں کھڑی ہیں؟۔ ان عوام کو قریب لانے کے لئے کیا کیا گیا۔

★ — بار بار جمہوری حقوق کی پامالی کا ذمہ دار کون ہے —؟

پاکستان کو حاصل کرلینے والی نسل اس قدر کمزور کیوں ہوگئی کہ ۲۴ویں برس پاکستان کے دشمنوں نے پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرلینے میں ڈرامائی کامیابی حاصل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

★ — ووٹ کا حق ملا۔ ووٹ کو استعمال کیا۔ تو پرانی نسل چیں بجبیں کیوں ہوگئی اور پوری قوم کو گمراہ قرار دے دیا گیا۔

★ — دیہات میں جاگیرداروں کا ظلم وتشدد کیوں جاری ہے اور زمین کا سینہ چیرنے والے کیوں تڑپ رہے ہیں۔

★ — شہروں میں کارخانے دھڑادھڑ سونا اگل رہے ہیں، لیکن کارخانے کو حرکت دینے والے مایوس ومحروم ہیں۔

★ — افسر جنہیں ہمارا خادم بنایا گیا تھا۔ وہ ہم پر مسلط ہیں۔ اپنا ہی حق حاصل کرنے کے لئے اپنے ہی وطن میں۔ ایسے ایسے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے کہ انسان اپنا وقار کھو بیٹھتا ہے عزت نفس سے محروم ہوجاتا ہے۔

★ — درسگاہیں ہر سال لاکھوں بے روزگار اگل کر سڑکوں پر پھینک دیتی ہیں۔

★ — حکومتیں۔ محلاتی سازشوں کے ذریعے قائم ہوتی اور ختم ہوتی رہی ہیں۔ عوام اپنے حصے کے لئے ترستے ہی رہے ہیں۔

★ — نام نہاد اور بزعم خود سیاسی رہنما عوام، اسلام اور ملکی سالمیت کے نام پر جان بوجھ کر جوڑ ڈرامے کھیلتے رہے، سوانگ رچاتے رہے، عوام کو دیدہ دانستہ فریب دیتے رہے

نئی نسل نے جب سے ہوش سنبھالا یہ سوالات اس کے ذہنوں میں تڑپتے رہے ہیں، آج نئی نسل پرانی نسل کے ہاتھوں ملک کو تباہی کے اس کنارے پر پہنچا دیکھ کر۔ اپنا حق حاصل کرنا چاہتی ہے۔

★ — وہ اپنے ملک کو تباہ وبرباد ہوتا نہیں دیکھ سکتی

★ — عوام کے حقوق پامال ہونے نہیں دیکھ سکتی۔

★ — کارخانے چلانے والے ہاتھوں کو محروم نہیں دیکھ سکتی

★ — ملک کے مالکوں کو ملک کے خادموں افسر شاہی کے ہاتھوں عزت نفس کھوتے نہیں دیکھ سکتی۔

★ — ملک کے وارثوں کو بے روزگار نہیں برداشت کرسکتی۔

★ — زمین سے زر اگانے والے ہاتھوں کو خالی نہیں دیکھ سکتی

★ — چرواہوں کو بھیڑوں کے لئے چارہ مہیا کرنے کی بجائے سودا کرتے نہیں دیکھ سکتی۔

★ — دنیا بھر میں اپنے وطن کو ذلیل ورسوا نہیں دیکھ سکتی۔

غیر ممالک کو بھی

بے نقاب کیجئے

"الفتح" نے اپنے یکم جولائی ۱۹۷۱ء کے شمارے میں مطالبہ کیا تھا کہ وائٹ پیپر شائع کیا جائے۔ اور اس وائٹ پیپر کے لیئے تین بنیادی سوالات اُٹھائے تھے:۔ مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا۔

مغربی پاکستان میں جو ردِ عمل ظاہر ہوا۔

غیر ممالک نے جو موقف اختیار کیا۔

۶۔ اگست ۱۹۷۱ء کو حکومت پاکستان نے یہ عوامی مطالبہ منظور کرتے ہوئے وائٹ پیپر شائع کر دیا، جو پاکستان کے کروڑوں شہریوں اور غیر ممالک کے کروڑوں ذہنوں میں گونجتے سوالوں کا کسی حد تک جواب دیتا ہے۔ "مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا" کے سلسلے میں مغربی پاکستان کے شہریوں تک جو کچھ سینہ بسینہ پہنچا تھا، وائٹ پیپر میں بیان کی گئی تفصیلات اس سے کچھ کم ہی رہی ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں ابھی اس وائٹ پیپر میں تکمیل کے لئے مزید اضافے کی ضرورت ہے۔ وہ پاکستانی شہریوں کے لئے بھی ضروری ہے۔ اور غیر ملکیوں کے لئے بھی۔ کہ فوج نے ملک کی سلامتی اور تحفظ کے لئے جو قدم اٹھایا ہے۔ اور اس میں اسے جو آپریشن کرنا پڑا۔ اس میں کتنے افراد گرفتار ہوئے۔ کتنی ہلاکتیں ہوئیں۔

غیر ملکی پراپیگنڈے کا جواب دینے کے لئے ضروری ہیں کیونکہ غیر ملکی اخبارات اور ایجنسیاں اس سلسلے میں خوفناک حد تک مبالغہ آمیزی کر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ پاکستان کے خلاف اس سازش میں بھارت کے علاوہ کن کن طاقتوں کا ہاتھ تھا۔ بھارت خود تو سامراج کا محض ایک آلۂ کار ہے۔ اس کے پیچھے جو قوتیں ہیں۔ اور ڈھاکہ میں بعض ممالک کے سفارت خانوں نے جو کردار ادا کیا، جہاں سے ٹرانسمیٹر پکڑے گئے، اور یہاں چھپے ہوئے کچھ منفا ھی لوگ بھی گرفتار کئے گئے۔ ان غیر ممالک کے نام بھی بتائے جائیں اس المیہ کے بعد بڑی طاقتوں نے جو کردار ادا کیا۔ دباؤ ڈالا، ردِ عمل ظاہر کیا۔ اس کی تفصیلات بھی من وعن بیان کی جائیں۔ اس سے غیر ملکی طاقتیں بھی بے نقاب ہوں گی، پاکستان کے عوام حقیقی صورتحال سے با خبر ہوں گے۔

اداریہ

شمارہ نمبر ۷ — یکم جولائی ۱۹۷۱ء

وائٹ پیپر شائع کیجئے

مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا۔
مغربی پاکستان میں جو ردِ عمل ظاہر ہوا۔
غیر ممالک نے جو موقف اختیار کیا۔

اس سلسلے میں ہماری حکومت حالات سے اچھی طرح باخبر ہے۔ عوام اس سے اس حد تک واقف ہیں جو ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے معلوم ہوا۔ لیکن عوام میں سخت تذبذب ہے۔ کیونکہ آج کی دنیا صرف ایک ملک یا علاقے تک محدود نہیں ہے لوگ غیر ممالک کے ریڈیو بھی سنتے ہیں۔ مختلف غیر ملکی اخبارات بھی پڑھتے ہیں۔ انڈیا کا ریڈیو جو کچھ راگ الاپتا ہے وہ بھی عوام کے کانوں سے گزرتا ہے۔ اس طرح عوام ایک ذہنی انتشار میں بھی مبتلا رہتے ہیں۔ اور کچھ تشنگی بھی محسوس کرتے ہیں۔ محب وطن اخبارات اور راہنما بھی اس حد تک کچھ لکھ اور کہہ سکتے ہیں جو سنسر کی حدود میں ہو۔ اس طرح عوام کے ذہنوں میں بہت سے سوالات کلبلاتے رہتے ہیں۔ اس ہفتے مرکزی بجٹ بھی پیش کیا گیا اور صدر مملکت کی تقریر بھی عوام کے سامنے آئی۔ عوام نے "اپنے آپ پر بھروسہ" کا درس دونوں میں سُنا۔ ہمارے عوام تو پہلے سے ہی اس کے حق میں ہیں وہ اپنے ملک کی سلامتی کے لئے قومی غیرت اور حمیّت کے جذبے سے اچھی طرح آشنا ہیں۔ انہوں نے غیر ممالک کے آگے ہاتھ پھیلانے کو کبھی بھی پسند نہیں کیا۔ اس بات پر ان کا دل ہمیشہ خون کے آنسو رویا ہے اور اب جب غیر ممالک نے پاکستان پر امداد کے بدلے سیاسی دباؤ ڈالا تو پاکستان کے عوام میں شدید ردِّ عمل تھا۔ اور انہیں افسوس تھا کہ اس سلسلے میں اُن سے پوچھا نہیں گیا۔ مگر جب صدرِ مملکت اور جناب ایم ایم احمد "خود کفالت" کے لئے عوام سے قربانی کے جذبے کو آواز دیتے ہیں تو انہیں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ جن حالات کے بعد وہ اس جذبے کا تقاضہ کر رہے ہیں اُن حالات اور جزئیات سے بھی قوم کو باخبر کیا جائے۔ قوم کو اعتماد میں لینے کے لئے ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا اس پر ایک وائٹ پیپر شائع کیا جائے۔ غیر ممالک نے اس پر جو ردِّ عمل ظاہر کیا ہے اس کو من وعن بیان کیا جائے۔ ان بیانات سے ہی عوام اپنے فرض سے خود آگاہ ہو جائیں گے۔ اور وہ خود طے کرلیں گے کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے۔ مسائل کے حل میں عوام کی شرکت اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ انہیں حالات سے پوری طرح باخبر بھی رکھا جائے۔ اور ہر قدم اُٹھانے سے پہلے انہیں اعتماد میں بھی لیا جائے اور عوام جن مشکلات اور جس کرب سے گزر رہے ہیں انھیں بھی دُور کیا جائے۔ اب ملک پر جو کڑا وقت پڑا ہے اُسے عوام کی شراکت کے بغیر دُور نہیں کیا جا سکتا۔ عوام کے راستے میں جو دیواریں کھڑی ہیں انھیں فوراً گرا دیا جائے کیونکہ اس ملک کے اصل وارث صرف اور صرف عوام ہیں۔ عوام کی قوت کے بغیر کسی بحران سے کامیاب و کامران نہیں گزرا جا سکتا۔

پروین اور شمیم کا تقدّس کیوں قائم نہ رہا؟

ساجع

تم تو بہرے ہو! تم تو پتھر ہو!

ساجع میدان صفا میں آخری بار بلند ہونے والی اس آواز کا شاہد ہے "لوگو! تمہیں عنقریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بابت سوال فرمائے گا...... خوب سن لو کہ اپنے مالوں کی زکوٰۃ نہایت خوشدلی سے دیا کرو"

لیکن بہروپ کے سحر نے اس آواز کی حلاوتیں چھین لیں، اس سیدھے سادھے پیغام کو تاویلات کا شکار کر دیا۔ بہروپ کا یہ سحر یہ کرشمہ اس آواز کو آگے سے جانے والوں کی ایک ضرب کا منتظر ہے ساجع سامع ہے۔

خدایا تو ہی بڑا ہے تو ہی ہمیشہ بڑا رہے گا سب بڑائی تیرے لیے

بڑائی تیرے لئے ہے۔ یہ ایک صداقت ہے۔

لیکن اے نظام زر کے لات ومنات، سنو آواز آرہی ہے کہ یہ مال یہ دولت سب یہیں رہ جائے گا۔ سنو اب زرافیت کا سودا اپنے نہاں خانوں سے نکلو گے کب تک سوانگ رچاؤ گے، سنو کیوں بھول رہے ہو کہ تمہیں ایک دن معبود کے حضور اپنی عبدیت کی ذمہ داریوں کا حساب دینا ہے۔ اس سے کوئی فرار نہیں۔ خوب سن لو کہ اپنے مالوں کی زکوٰۃ نہایت خوشدلی سے دیا کرو

اوہ! تم تو بہرے ہو۔ اوہ تم تو پتھر ہو۔ تم کہاں سنو گے؟ لات ومنات تو گرائے جاتے ہیں۔ اگر تم سن سکتے ہو تو آج ۱۸ سالہ عابدہ کا یہ سوال تمہارے کانوں کو چیر دیتا۔ تمہارے ضمیر کو جھنجھوڑ دیتا۔ تمہیں مجسمہ اقرار بنا دیتا اور ہاں! ایسی ہی ایک عابدہ کے سوال کی گونج ایک ۱۷ سالہ نوجوان کو دور دراز کے ایک ملک میں لے آئی تھی۔ یہ ۱۷ سالہ نوجوان وارث حق تھا۔ لیکن اس کی آواز کی گونج۔ ۲۳ سال ہوتے ہیں کہ صدا بصحرا بن چکی ہے۔

کیونکہ تمہاری دولت عابدہ کی عصمت کی بولی لگانے کے کام آتی ہے تمہاری دولت عابدہ کے سہاگ کا جوڑا خریدنے کا فریضہ ادا نہیں کر سکتی۔ اگر تم زکوٰۃ خوشدلی سے دیا کرتے تو آج عابدہ کی عصمت کی نیلامی کا اعلان تشہیر سے بچ جاتا۔

سنو! عابدہ کی آواز آرہی ہے۔

"میں ابھی بچی تھی، میری ماں اور باپ یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے، ان کے مرنے کے بعد میں اپنی معمر نانی کے پاس چلی گئی جو محنت مزدوری کر کے اپنا اور میرا پیٹ پالتی رہی، لیکن کچھ عرصے بعد وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں میں پھر اپنی ایک سہیلی کے پاس چلی گئی، جس نے مجھے لاہور کی ایک عورت رینو کے سپرد کر دیا۔ رینو نے مجھے پالا اور بری راہ پر ڈال دیا، رینو نے مجھے لاہور میں کمائی کا ذریعہ بنا دیا۔ اور اب روشنیوں کا شہر میری عصمت کی نیلامی کی تشہیر کا مقدر بن گیا۔

سنو! اس آواز میں پروین اور شمیم کی آواز بھی شامل ہے، ایک جس کے رشتہ داروں نے اس کے سر پہ ہاتھ نہ رکھا تو وہ پیٹ کے اس جہنم میں لڑھک گئی، اور دوسری جو لائل پور سے اپنی بیمار بہن کا علاج کروانے کراچی آئی تھی، اس رقم سے اس کا علاج پورا نہ ہوا تو بہن کی والہانہ محبت بہن کو تندرست دیکھنے کے معصوم جذبے سے مجبور ولاچار تمہاری دولت کے حوالے کر دیا،

تمہاری یہ دولت تو اس کے یہ کام بھی نہ آئی کہ اس سے وہ منتظر بیمار بہن کے لئے دوا خرید لیتی۔

اے ثناخوان تقدیس مشرق! سنو! مجبوریوں کے ہاتھوں معصوموں کی عصمتوں کی نیلامیوں کی تشہیر ہو رہی ہے۔ تم کیوں چپ ہو؟ یہ تو شرف النسائیت کا مسئلہ ہے۔ ع

کوئی پکار و اک عمر ہونے کو آئی۔

یہ اجتماعی ضمیر سے سوال ہے۔

یہ مال ومتاع کی زکوٰۃ دینے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے فرض کو خوشدلی سے ادا کریں۔ کہ کوئی حاجت مند نہ رہے۔

عابدہ سہاگن بنے

پروین اور شمیم کا تقدس قائم رہے۔







برصغیر کے مسلمانوں کو آزادی دلوانے سے ــــ ذہنی اور اقتصادی آزادی چھنوانے تک

۱۹۰۶ء سے ۱۹۷۱ء تک

مسلم لیگ کے بارے میں وائٹ پیپر

وہاب صدیقی

مسندِ اقتدار سامنے نظر آرہی ہے۔ اس پر براجمان ہونے کے لئے تینوں مسلم لیگیں متحد ہو رہی ہیں۔ اختلافات پر پردہ ڈالا جا رہا ہے اس اتحاد میں ایک خفیہ اور پُراسرار ہاتھ کارفرما ہے جو ملک کا موجودہ نظام برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ مسلم لیگ جس نے پاکستان میں اس نظام کو پروان چڑھایا کسی نہ کسی طرح برسراقتدار آجائے۔

مسلم لیگ ابتدا ہی سے نوابوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کی جماعت ہے۔ یہ طبقہ سامراج کا سب سے بڑا حلیف ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلم لیگ کا رویہ شروع ہی سے سامراج نواز رہا۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی۔ ایک نئے تجارتی سرمایہ دارانہ نظام" سے جو نو دولتیے ہندوستانیوں کا طبقہ وجود میں آیا تھا وہ اس جماعت میں شامل ہو گیا۔ مسلمان نوابوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کی اکثریت اس میں شامل نہیں ہوئی۔ ایک کاہن نے ان کے کانوں میں منتر پھونک دیا کہ "سیاست میں حصہ لینے کا وقت نہیں آیا۔ تم تعلیم میں ابھی پسماندہ ہو۔"

کچھ عرصے کے بعد ہندوستان کے ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں اور برطانوی سامراج کے مفادات متصادم ہوئے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے جو ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں کی نمائندہ تھی۔ ان کے مفادات کے تحفظ کے لئے جدوجہد شروع کی۔ بی، جی۔ تلک کی رہنمائی میں کلکتہ میں انگریزوں کے خلاف تحریک چلی۔ بلوے ہوئے۔ کچھ انگریز ہلاک بھی ہوئے۔ ان حالات میں انگریزوں نے مسلمان نوابوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کو آگے بڑھایا۔ لارڈ کرزن نے انتظامی امور کی بنا پر بنگال کو تقسیم کیا۔ لیکن تاثر یہ دیا کہ وہ مسلمانوں کی بھلائی چاہتا ہے۔ اس تقسیم سے ہندوستان کے سرمایہ داروں کے مفادات پر زد پڑتی تھی۔ اس لئے کانگریس نے اس کی زبردست مخالفت کی۔ برطانوی نوآبادکاروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خالص اقتصادی اور معاشی مسئلے کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ بنا دیا۔ کانگریس کا زور توڑنے کے لئے انہوں نے مسلمان نوابوں اور جاگیرداروں کو سیاست میں حصہ لینے کی شہ دی۔ نواب محسن الملک نے علیگڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر آر۔ جیولڈ کے صلاح و مشورے سے وائسرائے سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ مسٹر آر جیولڈ نے ملاقات کا انتظام کیا۔ اس وفد کی سربراہی سر آغا خاں کو، جن کی تاج برطانیہ سے وفاداری اور ہمدردی تعارف کی محتاج نہیں ہے، سونپی گئی۔ ان دنوں سر آغا خاں رنگون کے دورے پر تھے۔ وہ دورہ ملتوی کر کے ہندوستان آگئے اور یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ میں وائسرائے سے ملے اور نواب عماد الملک کی تحریر کردہ یادداشت وائسرائے کے سامنے پیش کی۔ اس یادداشت میں جداگانہ انتخابات، اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر آبادی کے تناسب سے کچھ زائد نشستوں، گزیٹڈ، نان گزیٹڈ، ہائی کورٹ اور چیف کورٹ اور وائسرائے کی انتظامی کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی اور ایک مسلم یونیورسٹی کے قیام جیسے بے ضرر اور غیر سیاسی مطالبات کئے گئے۔ ان مطالبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوابوں اور جاگیرداروں کا یہ وفد آزادی وطن کے لئے نہیں بلکہ اپنے چند اقتصادی اور معاشی مفادات کے تحفظ کے لئے وائسرائے سے ملا تھا۔ اس کے بعد ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء میں نوابوں اور جاگیرداروں کے اس ٹولے نے میدان سیاست میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی۔ ۳۰ دسمبر کے اجلاس میں نواب سر سلیم اللہ نے مسلم لیگ کے قیام کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے انڈین نیشنل کانگریس سے اختلاف کی ان وجوہات پر زور دیا۔

"کانگریس سے ہمارے موجودہ اور آئندہ اختلافات کی بنیاد تین باتوں پر ہے۔ پہلی بات تو کانگریس کے وہ مطالبات ہیں جو ہندوستان میں انگریزی حکومت کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ دوسری بات ان مسائل کی ہے جو ہمارے جائز مفاد کے لئے مضر ثابت ہو رہے ہیں۔ اور تیسری بات حکومت کے خلاف کانگریس کا جارحانہ رویہ ہے۔ جو ہمیں پسند نہیں۔"

اس کے علاوہ مسلم لیگ کے مقاصد کی پہلی شق یہ تھی "مسلمانوں میں برطانوی حکومت سے وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا اور حکومت کے اقدامات کے متعلق انکی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو دور کرنا۔" نواب سلیم اللہ کی تقریر اور مسلم لیگ کے مقاصد سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس جماعت کے قیام کا مقصد برطانوی نوآبادکاروں کی حکومت کو مضبوط اور غلامی کی زنجیروں کو مزید طاقتور بنانا تھا اور کانگریس

"انقلاب" نے محمود وٹ سے اختلاف کیا تو نیوز پرنٹ کا کوٹہ بند کر دیا گیا

سے اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان کے ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقہ کے مفادات کے لئے جدوجہد کر رہی تھی جو سامراجی حکمرانوں کے مفادات کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ نوابوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کے مفادات سے بھی متصادم تھی۔ کیونکہ ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں کا اوّلین اور بنیادی فرض جاگیرداری اور زمینداری کو ختم کرنا ہوتا ہے۔

مسلم لیگ کی برطانوی سامراج سے وفاداری اور ہندوستان میں نوآبادیاتی تسلّط برقرار رکھنے کی خواہش کا ثبوت آل انڈیا مسلم لیگ کے رہنما نواب وقارالملک کی اس تقریر سے بھی ملتا ہے جو انہوں نے مسلم نوجوانوں کے ایک اجلاس میں کی۔ فرماتے ہیں:

"ہر ایک حالت میں تم اپنے تئیں انگریزی فوج کے سولجر خیال کرو۔ تم تصوّر کرو کہ انگریزی پرچم تمہارے سروں پہ لہرا رہا ہے تم یقین کرو تمہاری دوڑ دھوپ اس لئے ہے کہ تم ایک دن تاج برطانیہ پر اپنی جانیں نثار کرو۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا حسرت موہانی آزادیٔ وطن کا نعرہ مستانہ بلند کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے رسالے "اردوئے معلّی" میں نواب وقارالملک کی اس تقریر پر نکتہ چینی کی۔

مسلم لیگ کے مطالبے "جداگانہ انتخابات" کو ۱۹۰۹ء میں منٹو مورلے اصلاحات کے تحت تسلیم کر لیا گیا۔ مسلم لیگ نے اسے اپنی زبردست کامیابی قرار دیا۔ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو خوشحالی کا مژدہ سنایا گیا۔ کیونکہ صرف ان دو ہی صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ لیکن دسمبر ۱۹۱۵ء میں بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کے مفادات کو "سیاسی حکمت عملی" پر قربان کر دیا گیا اور معاہدہ لکھنؤ کے تحت بنگال اور پنجاب کی مسلم آبادی کے تناسب سے کم نمائندے لینے پر کانگریس سے سمجھوتہ کر لیا گیا کانگریس اور مسلم لیگ نے معاہدہ لکھنؤ میں صوبوں کی حسب ذیل نمائندگی طے کی۔

صوبہ	کل مسلمانوں کی نمائندگی بحیثیت آبادی	نمائندگی جو معاہدہ لکھنؤ کے تحت طے کی گئی	فائدہ	نقصان
پنجاب	۵۵ فی صد	۵۰ فی صد	-	۵ فی صد
بنگال	۵۳ فی صد	۴۰ فی صد	-	۱۳ فی صد
بمبئی	۲۰ فی صد	۳۳ فی صد	۱۳ فی صد	-
یو۔پی	۱۴ فی صد	۳۰ فی صد	۱۶ فی صد	-
بہار	۱۵ فی صد	۲۹ فی صد	۱۴ فی صد	-
مدراس	۷ فی صد	۱۵ فی صد	۸ فی صد	-
سی۔پی	۴ فی صد	۱۵ فی صد	۱۱ فی صد	-

اس معاہدہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہو گئے۔ چودھری خلیق الزماں نے اس سمجھوتے کو مسلمانوں کی ناتجربہ کاری کہا ہے۔ اور اپنی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان" میں لکھتے ہیں "اگر اس وقت سیدھا سادا فیصلہ یہ کر لیا گیا ہوتا کہ دونوں قومیں اپنے اپنے صوبوں میں اپنی تعداد کے اعتبار سے نمائندگی حاصل کریں تو ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۵ء تک بنگال، پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں مسلم حکومتیں قائم ہو کر اپنی سطح پا لیتیں اور کل ہندوستان میں ان کی حیثیت محض ایک اقلیت کی نہ رہ جاتی۔" دراصل یہ مسلم لیگ کے رہنماؤں کی ناتجربہ کاری نہیں تھی بلکہ لیگ کے جاگیردار اور زمیندار ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے سے سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ سمجھوتہ کرتے وقت انہوں نے عوام کا مفاد نظرانداز کر دیا۔ لیکن جب ان کے مفادات آپس میں متصادم ہو گئے تو ۱۹۲۰ء میں دونوں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا رویہ اس وقت تک مصالحت پسندانہ رہا جب تک مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی جوہر اور قائداعظم اس میں شامل نہیں ہوئے

مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی جوہر عوامی رہنما تھے۔ عوام میں سے آئے تھے اور بہت پہلے نعرہ آزادی بلند کر چکے تھے۔ مصالحت پسندی اور سمجھوتے بازی ان کی فطرت کے خلاف تھی۔ ان کے آنے سے مسلم لیگ کی جڑیں عوام میں پھیلیں اور عوام اس پر اعتماد کرنے لگے۔ ان کی شمولیت کے بعد ہی مسلم لیگ نے عوامی رنگ اختیار کیا۔ اور جداگانہ وطن کا مطالبہ کیا۔ لیکن اس کے رہنماؤں کی اکثریت نوابوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کی رہی۔ اس لئے یہ جدوجہد میں تامل برتتی رہی اور جدوجہد سے گریز کرتی رہی۔ کانگریس نے "بدیشی تحریک" "تحریک عدم تعاون" اور "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریکات چلائیں۔ لیکن مسلم لیگ پُرامن اور باہمی گفت و شنید پر زور دیتی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی حکومت کانگریس کے سامنے جھکتی رہی۔ مسلم لیگ کو اس کمزوری کا شدید احساس ۱۹۴۶ء میں ہوا جب مسلم لیگ کو کیبنٹ مشن کا منصوبہ تسلیم کرنے کے باوجود عبوری حکومت بنانے کی دعوت نہیں دی گئی اور برطانوی حکومت نے کانگریس کے دباؤ میں آ کر اس میں سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ نے "یوم راست اقدام" منا کر حکومت پر دباؤ ڈالا۔ اس دن صرف کلکتہ میں پانچ ہزار افراد ہلاک ہوئے۔

چار رنگوں میں سرورق قیمت وہی

ہفت روزہ "الفتح" کی اس اشاعت خاص میں ضخامت معمول سے کچھ زائد رکھی گئی ہے۔ اور سرورق چار رنگوں میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود قیمت معمول کے مطابق ہی یعنی ۵۰ پیسے ہی ہے۔ "الفتح" یہ بوجھ اپنے قارئین کی دیرینہ وابستگی اور ان کے اقتصادی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے برداشت کر رہا ہے۔ قارئین کی والہانہ دلچسپی کے بجا طور پر شکر گزار ہیں اور امید ہے کہ وہ اپنے حلقے میں حسب معمول مزید وسعت پیدا کرتے رہیں گے۔
(ادارہ)

DAULTANA—GILANI PACT
(September, 1949)



سرفرانسس ٹکر " WHILE THE MEMORY SERVES " میں لکھتے ہیں کہ "۱۶ اگست کو زبردست فسادات ہوئے۔ کلکتے کی گلیوں اور کوچوں میں لڑائی ہوئی اور اس قدر افراد ہلاک ہوئے کہ ان کی لاشوں کو اوپر تلے مکانوں کی دیوار کے سہارے رکھا گیا" اگرچہ مسلم لیگ نے یوم راست اقدام منا کر اپنی قوت کا ثبوت مہیا کر دیا اور عبوری حکومت میں نمائندگی بھی حاصل کر لی۔ لیکن وہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور نہ کر سکی۔ یہ صرف کلکتے اور دوسرے صنعتی شہروں کے مزدور تھے جن کی زبردست ہڑتالوں اور مظاہروں نے برطانوی نوآبادکاروں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ بحریہ کی بغاوت نے بھی اس تحریک میں موثر کردار ادا کیا۔

جب پاکستان قائم ہوا تو مسلم لیگ ملک کی واحد سیاسی پارٹی تھی۔ سرخ پوش اور خاکسار تحریک دم توڑ چکی تھیں۔ تجویز پیش کی گئی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو دو حصوں میں منقسم کر دیا جائے۔ جو حصہ پاکستان میں ہے وہ پاکستان مسلم لیگ کہلائے اور ہندوستان والا "آل انڈیا مسلم لیگ۔ حسین شہید سہروردی نے اس تجویز کی زبردست مخالفت کی اور کہا " کیا بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے لئے اپنی سیاسی تنظیم فرقہ وارانہ خطوط پر قائم رکھنا درست ہے؟" ان کا موقف تھا کہ پاکستان ایک جمہوری ملک ہے اس لئے اس کی حکمران پارٹی کس طرح ایک خاص فرقے کے مفادات تک اپنی ذمہ داری محدود کر سکتی ہے۔ اس پر غیر مسلموں کی ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے۔ مسلم لیگ کو "پاکستان لیگ" کا نام دیا جائے۔ لیکن اس تجویز کو نظر انداز کر دیا گیا۔

پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لئے چوہدری خلیق الزماں کو مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا۔ اور لیگ کے آئین میں یہ دفعہ شامل کی گئی کہ "اگر مسلم لیگ کا کوئی عہدے دار حکومتی عہدہ قبول کر لے تو اُسے جماعت کے عہدہ سے دستبردار ہونا ہوگا" اس ترمیم کا مقصد یہ تھا کہ کابینہ پر مسلم لیگ کی گرفت رہے۔ اور اگر وہ دیکھے کہ کوئی وزیر یا کابینہ مسلم لیگ کے دستور اور پروگرام سے انحراف کر رہی ہے تو اس کا احتساب کیا جا سکے۔ لیکن بعد میں چوہدری محمد علی کے مشورے پر لیاقت علی خاں نے مسلم لیگ

دولتانہ نے قرآن کے ورق پر کئے گئے معاہدے کا بھی پاس نہ کیا

کی صدارت خود سنبھال لی۔ اس طرح پارٹی کمان اور حکومت ایک فرد کے ہاتھ میں آجانے سے کابینہ پر جماعت کی احتسابی گرفت نہ رہی۔ اور محلاتی سازشوں، جوڑ توڑ کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد مسلم لیگ نے اپنے آئین اور پروگرام سے انحراف کرنا شروع کر دیا۔ گورے حکمرانوں کے جانے کے بعد کالے حکمرانوں نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ ہندو بنیوں کی بجائے مسلمان سرمایہ داروں نے عوام کا استحصال شروع کر دیا۔ جن لوگوں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی وہی عوام کے سروں پر مسلط کر دیئے گئے۔ صوبوں میں بھی مسلم لیگ نے حکومتیں قائم کیں۔ مشرقی بنگال میں خواجہ ناظم الدین۔ سندھ میں ایوب کھوڑو، پنجاب میں نواب ممدوٹ اور سرحد میں قیوم خاں وزیراعلےٰ بنے۔

سب سے پہلے ایوب کھوڑو نے مرکز سے بغاوت کی۔ بین الاقوامی روایات کے مطابق مرکزی حکومت نے دارالحکومت کراچی کو حکومت سندھ کے کنٹرول سے لیا تو ایوب کھوڑو نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اور حکومت پاکستان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ " حکومت کراچی کو مرکز میں لینے سے پہلے بجٹ تو دیکھے کیا وہ کراچی کے نظم و نسق کے اخراجات برداشت کر سکتی ہے۔" لیاقت علی خاں نے اس کے جواب میں کہا " حکومتیں اپنے بجٹ کو نہیں فرصت جات کو دیکھتی ہیں۔ اگر حکومت کے پاس سونے کے بے پناہ ذخائر ہیں لیکن کریڈٹ نہیں تو سونا بالکل بے مصرف اور بیکار ہے جیسے ساحل سمندر کی ریت" اس کے علاوہ اقربا پروری، دوست نوازی کی انتہا کر دی اور بقول مانند کندن مل وکیل "ایوب کھوڑو کے روپ میں سندھ کو ہٹلر ثانی مل گیا تھا" چنانچہ ایوب کھوڑو پر ۶۹ الزامات لگائے گئے اور ۵۷ ثبوت اسپیشل ٹربیونل کے سامنے کئے گئے اور موصوف کو پروڈا کے تحت نااہل قرار دے دیا گیا۔

پنجاب میں نواب ممدوٹ نے اپنی حیثیت مستحکم کرنے کے لئے اخبارات سے یارانہ جوڑا۔ "نوائے وقت" کو پریس الاٹ کیا۔ روزنامہ "انقلاب" نے نواب ممدوٹ کی پالیسیوں سے اختلاف کیا تو صوبائی حکومت نے اس کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ بند کر دیا۔ کچھ عرصے تک یہ اخبار بلیک سے کاغذ خرید کر اپنا کام چلاتا رہا۔ لیکن کب تک؟ آخر یہ روزنامہ اپنی موت آپ مر گیا۔ میاں افتخار الدین پنجاب کے وزیر مہاجرین تھے۔ انہوں نے مہاجرین کی آبادکاری کے لئے نہایت جامع اور انقلابی منصوبہ بنایا کہ تمام جاگیرداریاں اور بڑی بڑی زمینداریاں ختم کر کے مہاجرین کو الاٹ کر دی جائیں۔ زمین کی قیمت قسطوں میں وصول کی جائے۔ لیکن پنجاب کے وزیر خزانہ میاں ممتاز دولتانہ، وزیر مال سردار شوکت حیات اور خود وزیراعلےٰ نے اس کی مخالفت کی۔ کیوں کہ تینوں کا تعلق زمیندار طبقے سے تھا۔ پھر پنجاب میں

سندھ میں مسلم لیگ نے کھوڑو سا ہٹلرِ ثانی دیا

بھی بدعنوانیوں اور اقربا پروری کا سلسلہ چل نکلا اور اس کی روک تھام کے لئے مرکزی حکومت کو ایک کمیٹی بنانی پڑی۔

کچھ عرصے کے بعد نواب ممدوٹ اور دولتانہ میں چل گئی۔ اقتدار کی رسہ کشی سے حکومت کی کارکردگی متاثر ہو رہی تھی۔ چنانچہ صوبے میں گورنر راج قائم کر کے ممدوٹ وزارت کو برطرف کر دیا گیا۔ پنجاب میں انتخابی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ دولتانہ نے وزیر اعلےٰ بننے کے دیرینہ خواب کو پورا کرنے کے لئے جوڑ توڑ کئے کچھ کو وزیر بنانے کا وعدہ کیا۔ تو بعض جگہ برادری اور خاندانی رشتوں سے کام نکالا۔ اور کہیں لوگوں کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھایا۔ ملتان کا گیلانی خاندان نہایت مذہبی اور با اثر خاندان ہے۔ میاں

دولتانہ نے ستمبر ۱۹۴۹ء میں قرآن کے ایک ورق پر اس خاندان سے ایک تحریری معاہدہ کیا۔ قرار پایا کہ گیلانی خاندان دولتانہ کی حمایت کرے گا اور اس حمایت کے بدلے میں گیلانی خاندان کی سیاسی برتری تسلیم کی جائے گی۔ لیکن صد افسوس دولتانہ نے کامیابی کے بعد اس معاہدے کی پرواہ نہ کی۔ غرضیکہ پنجاب کے اس انتخاب میں دھاندلیوں اور بدعنوانیوں سے کام لیا گیا۔ بیلٹ بکس توڑے گئے اور "جھرلو" کی مدد سے دولتانہ وزیر اعلےٰ بن گئے۔

وزارت عالیہ پر فائز ہوتے ہی دولتانہ نے دستور زبان بندی نافذ کر دیا۔ آزادی تقریر سلب کر لی۔ بعض اخبارات کو بند کر دیا۔ اور بعض کو رشوتیں دے کر خرید لیا۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

- ایک معمولی تکنیکی غلطی کی وجہ سے اپریل ۱۹۵۱ء میں نوائے وقت کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا گیا اور اس کا الاٹ شدہ پریس سربمہر کر دیا گیا اس کے بعد نوائے وقت والوں نے "جہاد" جاری کیا۔ لیکن دولتانہ نے پریس پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس اخبار کی طباعت بند کر دے۔ چنانچہ "جہاد" بھی بند ہو گیا بڑی مشکل سے نوائے وقت کا ڈیکلریشن بحال ہوا۔ دراصل تکنیکی غلطی تو محض ایک بہانہ تھی۔ یہ اخبار لیاقت علی خان اور دولتانہ حکومت پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ چنانچہ اس کو یہ سزا دی گئی۔
- "چٹان" اور "ایشیا" ایک ایک سال کے لئے بند کر دیئے گئے۔
- اخبارات کی اجتماعی خریداری پر دولتانہ نے دو لاکھ سے زائد روپے خرچ کئے۔ ان اخراجات کا مقصد اخبارات کی زبان بند کرنا تھا۔ مختلف اخبارات پر یہ رقم خرچ کی گئی۔

(۱) جون ۱۹۵۱ء: کل رقم پچاس ہزار روپے (آفاق ۴۶ ہزار، زمیندار ۴ ہزار)

(۲) دسمبر ۱۹۵۱ء کل رقم ۴۸ ہزار روپے (احسان ۱۸ ہزار روپے، آفاق ۱۸ ہزار روپے، زمیندار ۵ ہزار اور مغربی پاکستان ۷ ہزار روپے)

(۳) جون ۱۹۵۲ء: کل رقم ایک لاکھ ۲ ہزار روپے (زمیندار ۱۷ ہزار، آفاق ۴۰ ہزار، احسان ۴۰ ہزار، مغربی پاکستان ۵ ہزار روپے)

(۴) دسمبر ۱۹۵۲ء: صرف مغربی پاکستان پر تین ہزار روپے خرچ کئے گئے۔

صوبہ سرحد میں وزارت عالیہ کا قرعہ قیوم خان کے نام نکلا۔ جو کسی زمانے میں کٹر کانگریسی اور مرکزی قانون ساز اسمبلی میں کانگریس کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ لیکن یہ وطن عزیز کی سیاست کا المیہ ہے کہ منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔ خان قیوم وزیر اعلےٰ تو بن گئے لیکن انہیں یہ غم کھا رہا تھا کہ اسمبلی میں مسلم لیگیوں کی تعداد صرف ۱۵ ہے۔ جبکہ مخالفوں کی ۲۲۔ تو ایسی صورت میں بجٹ کیسے منظور کرایا جا سکے گا۔ چنانچہ انہوں نے گورنر کو مشورہ دیا کہ صوبائی اسمبلی کو برخاست کر کے ہر تیسرے سال ریفرنڈم کے ذریعے کسی شخص کو وزیر اعلےٰ منتخب کیا جائے اور وہ اپنے تین چار ساتھیوں کے ساتھ حکومت چلائے

باقی صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں

من گھڑت، لغو اور بے بنیاد صحافت کا پوسٹ مارٹم

تنگی کے کسانوں پر زمین تنگ ہے

ہفت روزہ "زندگی" نے مندنی کے کسانوں پر فائرنگ اور اصل واقعات پیش کرنے کی بجائے جس خبثِ باطن، صحافتی بددیانتی اور عوام دشمن جذبے سے کام لیا ہے، وہ نیا نہیں، اس بدنامِ زمانہ صحافت نے ہمیشہ اس مقولے کی پیروی کی ہے: "اتنا جھوٹ بولو کہ وہ سچ معلوم ہو" ——— ذیل میں مزدور کسان پارٹی کے صدر جناب اسحاق محمدؔ کا مضمون پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے ہفت روزہ زندگی کے جھوٹ کا پول کھل جاتا ہے کہ وہ اور اُن کے سرپرست کیا منصوبے بنا رہے ہیں۔ (ادارہ)

اسحاق محمدؔ۔ صدر پاکستان مزدور کسان پارٹی

۳ر جولائی ۱۹۷۱ء کی سہ پہر کو موضع مندنی تحصیل چارسدہ ضلع پشاور کے گردونواح میں مشین گنوں اور رائفلوں کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ دھماکے ہو رہے تھے۔ تمام علاقے پر سراسیمگی اور دہشت کا سماں طاری تھا۔ انسان تو ایک طرف چرندے پرندے، سب پناہ کے لئے بھاگ دوڑ رہے تھے۔ یہ فائرنگ رات بھر ہوتی رہی۔ دُوسرے دن اخباروں نے نیم سرکاری ذرائع سے جو خبریں دیں، اُن میں لکھا تھا کہ "دس سے پندرہ تک کسان مارے گئے ہیں اور تیس چالیس کے لگ بھگ زخمی ہوئے ہیں۔ ستر اسّی کسانوں کی گرفتاریاں ہوئی ہیں۔ گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہے۔" اخباروں نے یہ بھی لکھا تھا کہ "پولیس کا ایک سپاہی بھی زخمی ہُوا۔ گولی اُس کی پیٹی پر بندھی ہوئی لوہے کی پیٹی پر لگ کر اُس کے پہلو کو چیرتی ہُوئی نکل گئی۔" اخباروں نے یہ بھی لکھا کہ "اس معرکے میں قبائلی علاقے کے مہمندوں نے بھی حصّہ لیا جو اپنے مُردے اور زخمی رات کے اندھیرے میں اُٹھا کر لے گئے۔ پولیس نے دو کسانوں کی لاشوں پر قبضہ کیا" اخباروں نے خبر کی شکل میں اداریئے بھی لکھے جن میں کہا گیا کہ اس ہولناک واقعہ کی ساری ذمہ داری "پاکستان مزدور کسان پارٹی" پر آتی ہے۔ گوکہ اس کے لیڈر افضل بنگش اور اُن کے ساتھیوں کو دس مئی ۱۹۷۱ء کو ہی پابندِ سلاسل کر دیا گیا تھا لیکن اس پارٹی نے اپنے کارکنوں کو اس طرح تربیت دی ہے کہ وہ ہر قسم کے حالات کا سنبھالا کر سکتے ہیں۔ اس لیے اس پارٹی پر پابندی لازمی ہے ——

جاگیرداروں کے ہفت روزہ "زندگی" کا نمائندہ ۸ر جولائی ۱۹۷۱ء کو مقامی جاگیردار عبدالاکبر خاں کی خیریت دریافت کرنے کے لئے مندنی گیا۔ اس نے اپنی رپورٹ کا عنوان "تنگی کے خانوں پہ زمین تنگ ہو گئی" باندھا ہے۔ اس نے بھی نوکرشاہی کے بیان کی مبالغہ آمیز تائید کی ہے۔ اس کی اطلاع کے مطابق "قبائلیوں کے تقریباً ایک سو بیس آدمی ہلاک ہُوئے لیکن انہوں نے کسی کی لاش بھی یہاں نہ رہنے دی۔ بلکہ سب لاشیں اُٹھا کر بھاگ گئے۔ دس پندرہ زخمی ہُوئے جن میں پولیس کا ایک آدمی بھی شامل ہے۔" ان اعداد و شمار میں "زندگی" اس کے نامہ نگار اور اُس کے موکل جاگیرداروں کی خواہش کا اظہار ملتا ہے کیونکہ اس واقعہ میں گیارہ کسان مرد، دو عورتیں اور ایک بچّہ شہید ہُوئے۔ جن کی لاشوں کو سوائے دو کے پولیس نے قبضہ میں لینے سے انکار کیا۔ جن کو بغیر پوسٹ مارٹم کے دفنا دیا گیا اور جن کی قبریں ایک قریبی گاؤں میں موجود ہیں۔ پچاس کے قریب گھتے، کچھ مویشی اور بہت سے مرغے مرغیاں مارے گئے۔" زندگی" کے نامہ نگار کے بیان سے فائرنگ کی شدّت کا اندازہ البتہ ضرور ہو جاتا ہے۔

"زندگی" کے نامہ نگار نے خانوں کی وکالت کرتے ہُوئے لکھا ہے کہ "موجودہ واقعہ میں انتظامی مشینری نے بروقت اقدام کر کے صُورتِ حال کو مزید بگڑنے سے بچا لیا لیکن اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ ان واقعات کا اعادہ پھر نہیں ہوگا۔ مزدور کسان پارٹی کے مفاد پرست اور دُوسرے سیاسی عناصر اپنے مفاد کی خاطر جب بھی موقعہ ملا کشیدگی کو ہوا دیں گے۔ اس کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات ضروری ہیں۔

(۱) ان لوگوں کا خاتمہ ہونا چاہیئے۔"

(ملاحظہ فرمایئے کہ عوام کی جانب سے ٹھکرائے جانے والے فسطائی اب کیا کروانا چاہتے ہیں۔)

۳ر جولائی ۷۱ء کے اندوہناک واقعات کی مطابقت کے علمبرداروں نے جو تصویر پیش کی ہے وہ من گھڑت ہے۔ سفید جھوٹ ہے۔

سب سے پہلی بات تو قبائلیوں کی شمولیت کے بارے میں ہے اگر واقعی قبائلیوں نے شمولیت کی تو مرنے والوں اور زخمیوں کا موجودہ سکور کیسے ممکن ہے۔ قبائلی جنگجوئی میں شہرۂ آفاق ہیں۔ انگریزوں کے چھکے چھڑاتے رہے ہیں۔ نشانہ بازی میں بھی عالمی شہرت کے مالک ہیں۔ اور اوپر کے بیانات میں یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ پولیس کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ پہلے سے تیار تھے اور مورچے سنبھالے ہُوئے تھے۔ ان حالات میں پولیس اور فرنٹیر کانسٹبلری اور خانوں کثیر التعداد مسلّح ساتھیوں کا صرف ایک آدمی معمولی زخمی کیوں ہُوا۔ جب

ایک سازش ہے، جس کا نوٹس لینا اشد ضروری ہے

کہ دوسری طرف مرنے والوں کی تعداد بقول "زندگی" ایک سو بیس تک پہنچ گئی۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انتظامی مشینری نے کس قسم کا "بروقت اقدام" کیا ہے کہ جس سے صورت حال مزید بگڑنے سے بچ گئی ہے۔ حقیقت تمام مقامی آبادی پر روز روشن طرح عیاں ہے کہ کسانوں پر سراسر زیادتی ہوئی ہے۔ ان کے خلاف یک طرفہ کارروائی کی گئی ہے۔ قبائلی تو ایک طرف، یہاں کے مقامی کسان بھی اسلحہ کا استعمال خوب جانتے ہیں۔ قبائلی علاقے کے قرب نے ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت کو زندگی کا لازمہ بنا دیا ہے کسانوں نے بھی اسلحے کا استعمال کیا ہوتا تو نتیجہ وہ نہ ہوتا جو ظاہر کیا گیا ہے

اس واقعہ کی خبر بنانے والوں نے مزدور کسان پارٹی کو سارے واقعہ کا مجرم گردانا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس پارٹی کا جرم کیا ہے۔ اس جرم کی نوعیت کیا ہے۔ واقعات کو جس ڈھب سے پیش کیا گیا ہے اس سے ایک خطرناک حد تک بیمار ذہنیت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس ذہنیت کے مطابق کسانوں کا اپنے حقوق کے لئے مل کر جدوجہد کرنا جرم ہے۔ ہر عوامی تحریک ایک عوامی سازش ہے اس کی رو سے پاکستان کی سالمیت جاگیرداری نظام کی بقا سے وابستہ ہے۔ کسانوں کو منظم کرنا فساد پھیلانا ہے۔

حقیقت یہ ہے جاگیرداری نظام کے ان مویدوں اور نقیبوں نے یہ سارا کھیل یونہی نہیں کھیلا۔ اس کے پیچھے منصوبہ کاری ہے۔ واقعات کی رپورٹنگ میں جو جارحیت برتی گئی ہے وہ واقعات پر پردہ ڈالنے کے لئے ہے۔ ایک فرانسیسی جرنیل کا مشہور مقولہ ہے کہ "جب مدافعت کی کوئی سبیل نہ ہو تو حملہ کرو۔ حملہ کرو۔" انہوں نے اسی اصول پر عمل کیا ہے۔ کسانوں کی مخالفت میں اس خبر کو اس طرح گھڑا گیا کہ گویا پاکستان کو قبائلیوں کے حملے سے بچایا گیا ہے۔ جارح کسانوں کے حملے کو پسپا کیا گیا ہے۔ قانون اور انتظام کی حفاظت کی گئی ہے مظلوم جاگیردار کو کسان لٹیروں سے بچایا گیا ہے۔ مزدور کسان پارٹی کو گردن زدنی قرار دیا گیا تاکہ یہ معاملہ قومی سانحہ کی اصل حقیقت کھو کر پارٹی بازی کا مسئلہ بن جائے۔ اور اس پارٹی پر پابندی کی دھمکی اس لئے ہے کہ دوسری پارٹیاں مرعوب ہو کر چپ ہو جائیں لیکن حقیقت اتنی تلخ ہے کہ اس گھنے جھوٹ کا پنپنا دشوار ہو گیا ہے۔

اس صدمے نے قوم کے محب وطن عوام دوست عناصر کو جھنجھوڑ دیا ہے کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ جو لوگ ہمہ وقت طبقاتی کشمکش کو دبانے کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں اور مزدور کسان رہنماؤں کو اس کی زد میں لاکر انھیں طرح طرح کی سزاؤں کا نشانہ بنواتے ہیں ۳ جولائی ۱۹۷۱ء کو مندنی میں خود انہی کی تھیلی کے چٹوں بٹوں نے طبقاتی کشمکش کی آگ بھڑکائی۔ کسانوں کو لپیٹ میں لے کر گرد و نواح کے عوام کے جذبۂ انتقام کو بھڑکایا۔ کیا افسر شاہی اور خوانین پر مشتمل یہ عناصر ان کڑے قوانین کی زد میں نہیں آتے جو طبقاتی کشمکش کو دبانے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ مہمند قبائل کے خلاف خواہ مخواہ کا پراپیگنڈہ کر کے، ان کی پاکستانی علاقے پر فرضی یلغار کے جھوٹے قصے بنا کر کیا یہ کوشش نہیں کی گئی کہ پاکستان کی مغربی سرحد پر گڑبڑ کرائی جائے؟ چونکہ ایسا کرنے والے لوگ شہرت یافتہ امریکہ پسند ہیں اس لئے اس بات کا جواز موجود ہے کہ یہ سب کچھ ایک منصوبے کے تحت کیا جا رہا ہے اور خانہ جنگی کی کیفیت جان بوجھ کر پیدا کی جا رہی ہے تاکہ اس علاقے سے متعلق معروف امریکی پالیسی کو ہوا دی جائے۔

شمالی ہشت نگر کے
کھیت مزدوروں
کا المیہ انصاف
کا طالب ہے

جن مزدوروں نے ۷۰، ۱۹۶۹ء کی عوامی تحریک میں حصہ لیا تھا۔ اور اس طرح ہماری قوم پر سے آمریت کی جکڑبندیوں کو توڑنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اور جن کسانوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اس عوامی تحریک کی تصدیق کی تھی وہ سب آج چھانٹی، بے دخلی، تعزیری مقدمے بازی اور کڑی سزاؤں کا نشانہ بنے ہوتے ہیں۔ انتخابات میں کسانوں نے جی کڑا کر کے عاجزی اور بے نوائی کے صدیوں پرانے نقاب اپنے چہروں سے نوچ کر پھینک دیئے تھے اور جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور سامراج کے ہمنوا طاغوتی قوتوں کو کھلم کھلا دھتکار دیا تھا۔ وہ آج بالکل اس شکار کی طرح جس پر سے یکایک جنگل کے درختوں اور جھاڑیوں کا پردہ ہٹ جائے۔ کھلے میدان میں شکاریوں کے رحم و کرم پر پڑے ہیں۔ ان عوام دوست پارٹیوں کے رہنماؤں کے لئے یہ لمحۂ فکریہ ہے، ان کو چاہئے کہ وہ انتخابات کے بعد کی اپنی پالیسی پر نظر ثانی کریں۔ ان کو تاریخ سے سبق لینا چاہئے کہ اقتدار کے سہارے صرف وہ پارٹیاں زندہ رہتی ہیں جو اقتدار کے سہارے وجود میں آتی ہیں۔ جن پارٹیوں کو عوام نے جنم دیا ہے وہ اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک محنت کش عوام میں زندگی ہے

ہشت نگر کی کسان تحریک نے اڑتے تنگ کے اس مقولے کو صحیح ثابت کر دیا ہے کہ جدوجہد کرنا، ناکام ہونا، پھر جدوجہد کرنا، ناکام ہونا۔ پھر جدوجہد کرنا... یہاں تک کہ اپنی فتح، یہ ہے کہ عوام کی منطق......"

ہشت نگر کی زمین انگریزوں کے آنے سے پہلے کاشتکاروں کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی جس میں سے ان کو صرف سرکاری واجبات ادا کرنے ہوتے تھے مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کئے ہوئے جاگیردار دراصل حاکمان علاقہ ہوتے تھے۔ جن کو سرکاری واجبات ایک حد تک اپنے مصرف میں لانے کی اجازت ہوتی تھی۔ یہ پنج ہزاری، دس ہزاری جاگیردار شاذ و نادر ہی جاگیریں وراثت میں پاتے تھے۔ انگریزوں نے اس سارے سسٹم کو بدل دیا۔

انگریزوں نے سب سے پہلے ۱۷۹۳ء میں بنگال میں بندوبست استمراری کے ذریعے مالیہ اکٹھا کرنے والے ٹھیکیداروں کو زمین کا مالک بنایا اور

حکام کسانوں کی بجائے خانوں کو قابو میں رکھیں

اس طرح کاشتکاروں کی گردنوں پہ جاگیرداروں کو سوار کر دیا۔ اس سے تقریباً ایک سو سال بعد مغربی پاکستان کے علاقے میں بھی انگریز نے مالک کسانوں پر ان لوگوں کو بطور خان، نواب، نواب زادہ وڈیرہ میاں، چودھری، ملک، سردار وغیرہ مسلط کر دیا۔ جنہوں نے انگریز سے وفاداری کی تھی، یا جن کی وفاداری انگریز خریدنا چاہتا تھا۔ اس طائفہ میں انگریز حکمرانوں نے اپنی جبلی شیطنت کے ساتھ طرح طرح کے ڈاکوؤں۔ رسہ گیروں قوم کے غداروں اور دوسرے بدمعاشوں کو شامل کر دیا۔ ہشت نگر کے کسانوں پر بھی ابتلا کا یہ دور ایک سو سال پہلے شروع ہوا۔ جب انگریز نے ان پر اپنے وفاداروں کو بطور خان کے مسلط کر دیا۔ اسی وقت سے کسانوں کی موجودہ جد وجہد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

حالیہ سالوں میں ہشت نگر کے کسانوں نے اپنے حقوق کے لئے جد وجہد پاکستان بننے سے ذرا پہلے ڈاکٹر خان صاحب کی کانگرس وزارت میں کی لیکن اپنی پارٹی کے پروگرام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ڈاکٹر خان صاحب نے اپنے بھائی خانوں کی بھرپور امداد کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہشت نگر کے کسانوں نے ڈاکٹر خان صاحب کی مخالفت میں پاکستان کی تحریک کی جوش وخروش سے حمایت کی۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد قیوم خان کی مسلم لیگی وزارت نے کسانوں کی طرف معاندانہ رویہ جاری رکھا۔ اور ان پر خانوں کا تسلط پوری جابریت کے ساتھ بدستور قائم رہا۔

ایوب خان کی نام نہاد زرعی اصلاحات کے بعد کسانوں پہ دباؤ اور ظلم اپنی انتہا کو پہنچ گئے سب سے بڑا ظلم بے دخلی کا تھا۔ اب تک کسانوں سے بے گار لی جاتی تھی اسی بیگار کے سلسلے میں ان کی نوخیز، جوان اور بوڑھی عورتیں خانوں کے گھر میں کام کرتی تھیں۔ کسانوں پر طرح طرح کے دوسرے ظلم بھی ڈھائے جاتے تھے۔ جاگیرداروں کا نمائندہ ہفت روزہ "زندگی" بھی یہ لکھے بغیر نہیں رہ سکا ہے کہ "کہا جا سکتا ہے کہ کہ خواتین کا کسانوں کے بارے میں اور مجموعی معاشرتی طرز عمل کسی طرح قابل تعریف نہیں انہوں نے اس غیور اور جسور قوم میں فحاشی اور بے حیائی کے جراثیم پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے یہ بھی درست ہے وہ اپنے مزارعین کو ناجائز تکلیفیں دیتے ہیں۔۔۔" ایوب خان نے ایک تو کسانوں کی بے دخلیوں کو سہل بنا دیا تھا۔ (معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حکومت کی سرکاری اہلکاروں کو ہدایت تھی کہ وہ خانوں کی پوری پوری حامی بھریں) دوسرے اب کے جب خان ایک کسانوں کو بے دخل کرتے تھے تو دوسرے کسانوں کو اس کی جگہ نہیں بٹھاتے تھے، بلکہ ٹریکٹروں کے سہارے خانوں نے اراضی کے وسیع ٹکڑوں کو "خود کاشت" فارموں میں بدل دیا اس کے نتیجے میں کسانوں میں بے روزگاری نے وبا کی صورت اختیار کرلی۔ وہ زمین کے لئے مارے مارے پھرنے لگے زمین حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے اور خانوں کے ہاتھوں ہر طرح کی ذلت برداشت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ایوب شاہی کے خلاف ۱۹۶۹-۷۰ کی عوامی تحریک نے زور پکڑا تو ہشت نگر کے کسانوں نے بھی انگڑائی لی۔

ہشت نگر کی کسان تحریک ملک کی طاغوتی قوتوں کے لئے سوہان روح کیوں بن گئی ہے ۲۳ جولائی ۱۹۷۱ کو ہشت نگر کے کسانوں کو کیوں اس تدبیر ہمی

یہ کسان وہی ہیں جنہوں نے پاکستان کے لئے ڈاکٹر خان کو نیچا دکھایا تھا۔

سے کچلا گیا؟ نہ۔ آج وہاں ہزاروں محنت کشوں کو کیوں غضب و بربریت کا نشانہ بنایا جا رہا ہے؟ یہ سوالات ہیں جو آج ملک و قوم کے ہر بہی خواہ کو مستردد کئے ہوئے ہیں۔ میری نظر میں اس تحریک کے مندرجہ ذیل پہلو خاص توجہ کے مستحق ہیں۔

(۱) لوکل سیلف گورنمنٹ، ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء کو منڈنی کے مقام پر بے زمین کسانوں اور کھیت مزدوروں کی عظیم الشان ریلی تھی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء کا لوڈہ ٹیک کی عظیم الشان ریلی منعقد ہوئی۔ یہ مغربی پاکستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی غالباً سب سے بڑی ریلی تھی ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ کا لوڈہ ٹیک سنگھ میں کسانوں کا اجتماع غالباً زیادہ بڑا تھا۔ لیکن اس میں بے زمین کسانوں اور کھیت مزدوروں کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی منڈنی کی اس ریلی میں کسانوں نے اجتماعی طور پر مندرجہ ذیل حلف اٹھایا:۔

(ا) کسان آپس میں اتحاد قائم کریں گے اور ایک دوسرے کے خلاف ہر قسم کے دیوانی فوجداری یا دوسری نوعیت کے تنازعے اپنی کمیٹیوں کے ذریعے طے کریں گے

(ii) کوئی کسان کسی دوسرے کسان کے زیر کاشت رقبے کو خان سے مل کر اپنی کاشت میں لانے کی کوشش نہیں کرے گا۔

(iii) خان کے ظلم وستم کا کسان مل کر مقابلہ کریں گے

(iv) کھیت مزدوروں کی اجرت میں چار آنے یومیہ کا فوری اضافہ ہوگا اور ان کے ساتھ برادرانہ سلوک کیا جائے گا۔ (یہ علاقہ ملوں اور سگریٹ کمپنیوں کے لئے گنا اور ورجینا تمباکو کی فصلیں تیار کرتا ہے۔ اس کے لئے ہر کسانوں کو وقتی طور پر کھیت مزدوروں کی امداد لینی پڑتی ہے)

یہ حلف کوئی عجیب وغریب بات نہ تھی۔ عجیب و غریب بات جو ہوئی وہ اس پہ عملدرآمد ہے۔ تمام کسانوں نے اس حلف کو نہایت صدق دل سے قبول کیا۔ چنانچہ کسانوں کی آپس کی مقدمہ بازی فوراً بند ہو گئی۔ جس کے نتیجے میں راشی افسروں، وکیلوں، پولیس اور محکمہ مال کے اہلکاروں کی بالائی آمدنی بالکل رک گئی۔ آج مقامی افسرشاہی اور خانوں میں ملی بھگت کی ایک وجہ ان دونوں کے معاشی مفادات پر یہ زد بھی ہے۔

خان جب کسانوں کو آپس میں لڑانے میں ناکام کر دیئے گئے تو ان کی تمام دھاندلیاں خالی کارتوس کی طرح بے کار ہو گئیں۔ کسانوں کا ایک دوسرے پر اعتماد بڑھ گیا تو انہوں نے بیگار سے انکار کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ خانوں اور کسانوں کا آپس میں رابطہ اس معاہدہ تک محدود ہو گیا جو کسانوں کو کرایہ پہ زمین دیتے وقت کیا جاتا ہے۔ مقدمات میں ملوث، بیمار

لاچار یا تنظیمی کاموں میں معروف کسانوں کی اراضی پر دوسرے کسانوں نے بلامعاوضہ کام کرنا شروع کر دیا ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ خانوں پرسے جاگیرداری کا شاہی لبادہ اتر گیا اور وہ صاحب جائداد لیکن عام شہری بن گئے۔ اس کے ساتھ ہی افسر شاہی کے استبداد کا راستہ بھی رک گیا۔

(ب) اجتماعی سوداکاری: یہ بات ایک الزام کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہشت نگر کے کسانوں نے زمینوں پر زبردستی قبضہ کرنے کا پروگرام بنایا ہے ان کے مطالبات میں زرعی اصلاحات کی بات کبھی بھی شامل نہیں ہوئی ان کی ساری جدوجہد زرعی تعلقات میں تبدیلی کے لئے رہی ہے خانوں کی خود کاشت اراضی کو کھیت مزدوروں میں تقسیم کرنے کی بات ضرور ہوئی ہے لیکن بطور مزارع کے بطور مالک کے نہیں۔ ہشت نگر کے کسانوں نے اجتماعی سوداکاری پر ضرور اصرار کیا ہے۔ اس کے لئے سہ پائی (خانوں اور کسانوں کے نمائندوں اور سرکاری افسروں پر مشتمل) اصلاحی کمیٹیاں بھی قائم ہوئی ہیں۔ لیکن خانوں نے تعاون کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ خانوں کو جس بات کا دکھ ہے وہ یہ ہے کہ کسان اب گڑ گڑا کر درخواستیں کرنے کی بجائے گفتگو کے لئے اپنے نمائندے بھیجتے ہیں

(ج) محنت کشوں کا بھائی چارہ: محنت کشوں کے دشمن ہشت نگر کی کسان تحریک کو قبائلی رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت اس سے بعید ہے۔ اس کے برعکس ہوا یہ ہے کہ کسانوں نے اپنی قبائلی عصبیتیں مٹا دی ہیں۔ ہشت نگر کے کسان اب صوبہ سرحد میں مبلغ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی نجات ملک بھر کے محنت کشوں کی سرخروئی کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے دیر، سوات، مردان اور پشاور کے دوسرے علاقوں میں جا کر کسانوں کے ساتھ اتحاد کیا ہے۔ اور ان کے ساتھ تجربات کا تبادلہ کیا ہے۔

اپنے ایک گذشتہ بیان میں میں نے ۳ر جولائی ۱۹۷۱ء کے واقعہ کو شکاگو کے مزدوروں کی ۱۸۸۶ء کی شہادت سے مماثلت دی ہے۔ کہ کسانوں کی شہادت کا یہ واقعہ پاکستان میں کسانوں کی تحریک میں ایک منفرد حیثیت پائے گا۔ اور ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔ اور ان شہیدوں کے مزاروں پر ہر برس میلے لگیں گے، دُنیا میں بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں، بہت لوگ مارے جاتے ہیں لیکن انسانی ذہن بعض چیزوں کو بطور ایک یادگار کے قبول کر لیتا ہے۔ انہی میں کربلا کا واقعہ، شکاگو کے مزدوروں کی شہادت، حسن ناصر کی شہادت اور مندنی کا المیہ ہے۔

جلی ہوئی زمین پر بارش کا پہلا قطرہ گرتے ہی غائب ہو جاتا ہے لیکن اس کی شہادت سے ابھرنے والی جانفزا خوشبو کا جو اثر ہوتا ہے وہ آنے والی موسلادھار بارش کا نہیں ہوتا۔ آج پاکستان تاریخ کے موڑ پر ہے۔ اب تک جاگیردار، سرمایہ دار اور سامراجی دلال یہاں کے مزدوروں کسانوں پر اطمینان سے سواری کر رہے تھے۔ ان کی محنت کو اپنی عیاشی اور بدکاری کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ لیکن اب ان انسانی سواریوں نے بدکنا شروع کر دیا ہے سارے عالم میں مساوات، حریت اور بھائی چارے کا چرچا ہے دنیا اب سوشلزم کے عالمی دور میں داخل ہو رہی ہے۔ استحصالی طبقوں نے تاریخ سے سبق لینے کی بجائے جبر و تشدد کی راہ اختیار کی ہے۔ ان کا محنت کشوں کو خون و خاک میں غلطاں کرنا۔ ان کی طاقت کی نہیں بلکہ ان پر چھا جانے والی عدم اعتماد کی کیفیت کا مظہر ہے جب ایک سوار اپنی سواری کو بھی جان سے مارنے لگے تو سمجھ لو کہ اس کا سفر جاری نہیں رہ سکتا۔ مندنی کا ۳ر جولائی ۱۹۷۱ کا واقعہ پاکستان میں تاریخ کے پلٹ جانے کے اسی لمحے کی نشاندہی کرتا ہے۔

ضیاء سرحدی کی یادداشتیں (۳)



بروا کی فلموں میں عورت

محبت کا مرکز ہی نہیں محبت کا سرچشمہ بھی تھی

میں کرانی کی ٹیم کی تقلید پسندی سے بیزار ہوگیا

ممتاز فلمساز، ہدایتکار ضیاء سرحدی نے الفتح کیلئے لکھا

کلکتہ پہنچتے ہی کرانی باداؤں کو لوگ اسی طرح مخاطب کیا کرتے تھے) اپنی فلم کی کاغذی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ کہانی سے متعلق کاموں میں انہوں نے مجھ کو بھی باقاعدگی کے ساتھ شریک رہنے کی ہدایت کردی۔ مجھ کو انہوں نے اپنے ادبی نائب کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا۔ لہٰذا میرے لئے یہ واجب تھا کہ میں کہانی کی مقررہ نشستوں میں اُن کے ساتھ ساتھ رہوں۔ کرانی باداُن دنوں بمبئی کے ایک بڑے ہدایت کار شمار کئے جاتے تھے اور اُن کی حالیہ تصویر "دولت کا نشہ" خاصی کامیاب گئی تھی۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اسی کامیابی کے پس منظر کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کے مارواڑی مالک نے اُن کو اپنی فلم "قسمت کی کسوٹی" کے لئے انگیج کیا تھا۔ لیکن میں نے کرانی کی کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی، اس لئے ان کی تخلیقی صلاحیتوں سے میں ہنوز پوری طرح آشنا نہیں تھا۔ محبوب کے ساتھ چند روز رہ کر میں نے فلم سکرپٹ کے 'کا' 'کے' 'کی' کے بارے میں جو کچھ جانا اور سمجھا تھا۔ اپنی ابتدائی سوجھ بوجھ کے پیش نظر بھی وہ میرے لئے ناکافی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سکرپٹنگ ایک گہرا اور اتھاہ مضمون ہے۔ اور مجھے اس ضمن میں آئندہ بہت کچھ سیکھنا ہوگا۔ اس علم سے روشناس کرنے والی کتابیں بھی ہنوز میری نظر سے بالکل نہیں گزری تھیں۔ اور جو کچھ میں لکھتا اور سوچتا تھا وہ صرف اُن تجربات اور INSPIRATIONS کی بنا پر تھا جو مجھ کو مختلف فلموں کے دیکھنے سے ملا کرتا تھا۔ اپنے اسی مسلسل احساس کی وجہ سے میری یہی کوشش رہتی تھی کہ سکرپٹنگ کے مختلف پیچ و خم اور اس کی باریکیوں کو جہاں جہاں اور جس طرح مناسب موقعہ ملتا رہے سیکھنے کی صورت پیدا کرتا رہوں۔ اسی جذبہ سے میں نے کرانی باوا کی کہانی کی نشستوں میں بھی حصّہ لینا شروع کیا۔ اور بہت ہی مخلصانہ طور پہ میں ہمیشہ ڈِسکشنز میں پہنچتا رہا۔ لیکن چند ہی روز میں مسٹر کرانی اور اُن کے چیف افسانہ نگار ساگر حسین کی تقلید پسندی جب کھل کر سامنے آنے لگی تو مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ بہت ہی محدود فکر و نظر کے لوگ ہیں۔ یہ کہانیاں نہیں لکھتے بلکہ فلم کے مقررہ نسخے لکھتے ہیں۔ یہ تخلیقی کام نہیں کرتے بلکہ مشینی کام کرتے ہیں۔ ساگر حسین اور کرانی کی نسخہ پسندی اور غیر تخلیقی طرزِ عمل جیسے جیسے بے نقاب ہوتا رہا میری مایوسی اور DIS-ILLUSIONMENT بڑھتی رہی

میں نے اِن دونوں کو رفتہ رفتہ جب بجید INHIBITED محسوس کرنا شروع کیا تو پس پردہ میں نے پھر یہ کوشش شروع کی کہ دوسرے ہدایت کاروں اور افسانہ نگاروں سے راہ و رسم پیدا کرکے اُن سے کچھ سیکھوں کچھ عرصے سے کلکتہ کی فلمسازی کے ہندوستان بھر میں بڑے چرچے تھے۔ کلکتہ کے چند ذہین اور دانشور ہدایت کاروں کی حالیہ تصویروں نے ہندوستانی صنعتِ فلم سازی کو جھنجھوڑنا شروع کردیا تھا۔ اور ہندوستان کے طول و عرض میں یہ خیال عام ہوچلا تھا کہ کلکتہ مستقبل قریب میں بمبئی اور کسی حد تک پونا کی فلمسازی پر بھی سبقت حاصل کرے گا۔ یہ چند ہدایت کار جو نیو تھیٹرز کے لئے تصویریں بنایا کرتے تھے خاصے صاحب فکر و نظر تھے۔ مضامین اور فلمی کہانیوں کے چناؤ کے معاملے میں بھی یہ لوگ بہت ہی بے باک ثابت ہو رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ یہ لوگ بمبئی کے فلمسازوں اور ہدایت کاروں کی نسبت زیادہ باشعور اور پڑھے لکھے لوگ تھے۔ خاص طور پر بروا اور دیبو کی بوس ایسے ہدایت کار اس اعتبار سے بہت نمایاں تھے

جس زمانے میں کرانی کے ساتھ میں کلکتے پہنچا تھا اس وقت ایسٹ انڈیا فلم کمپنی میں دیوکی بوس اور کاردار بھی اپنی اپنی فلمیں بنا رہے تھے۔ کرانی اور اس کی ٹیم سے جیسے ہی مجھ کو مایوسی ہونے لگی۔ میں نے فرصت کے اوقات میں اِن دونوں ہدایت کاروں سے اجازت لے کر اِن کے سیٹوں پر جانا شروع کردیا۔ کاردار کی زیرِ تکمیل اس وقت تین تصویریں تھیں۔ لیکن زیادہ تر اس کی جو تصویر شوٹ ہوتی رہتی تھی۔ وہ آغا حشر کاشمیری کی لکھی ہوئی "عورت کا پیار" تھی۔ کاردار کے سیٹ پر اس تصویر کی شوٹنگ میں جب بھی پہنچا مجھے مرغ مسلم قسم کے مرغن، بڑے بڑے اور موٹے موٹے مکالموں کی آوازیں سنائی پڑتی تھیں۔ اپنی اس STUDY کے ایام میں کاردار کی خاص بات جو اُبھر کر میرے سامنے آنے لگی تھی۔ وہ اس کی مصورانہ کوشش تھی۔ کاردار بنیادی طور پہ مصور تھا اور ان رجحانات کی بنا پر CAMRA COMPOSITION اور زاویوں کے بارے میں بہت محتاط رہتا تھا۔ افراد

مختار بیگم "عورت کا پیار" کی بھی ہیروئن تھی اور آغا صاحب کی بھی

اور سیٹ کے مختلف حصّوں اور پہلوؤں کو زاویاتی حسن کے ساتھ پیش کرنا اُس کا ایک خاص ہنر اور گُن تھا۔ لیکن ایک بار جب زاویہ طے ہو جاتا تو اس کے بعد فوراً ہی فریم میں آغا حشر کے مکالمے توپوں کی طرح گرجنے شروع ہو جاتے۔ اور فلم کا سٹیج آغا صاحب کی FLOWERY مکالمہ بازی کی وجہ سے تھیٹر کا اسٹیج بن کے رہ جاتا۔ ایک آدھ مرتبہ مجھے یاد ہے کہ کاردار نے مرئی تقاضوں کی وجہ سے آغا صاحب کے مکالموں میں کچھ کانٹ چھانٹ کر دی۔ مختار بیگم نے جو اس زمانے میں بیک وقت "عورت کے پیار" کی ہیروئن بھی تھی اور آغا صاحب کی بھی۔ کاردار کی اس جرأت کو کہ اس نے آغا کے مکالمے کو کانٹ چھانٹ دیا۔ بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا۔ پہلے تو سیٹ پر ہی اُس نے کاردار سے کچھ گفتگو کی، اور جب کاردار کو بضد پایا تو پھر اُس نے گھر پہنچ کر آغا صاحب سے شکایت کر دی۔ آغا صاحب دوسرے روز صبح صبح کھیمکا کے دفتر پہنچے اور پھر کیا تھا۔ آن کی آن میں کھیمکا کا دفتر ایک اچھا خاصا تھیٹر نظر آنے لگا۔ آغا صاحب بہت گرجے، بہت برسے اور انھوں نے غصّے کے عالم میں بحق کاردار، موٹی موٹی اور اَن سُنی مغلظات سے بھی کام لیا۔ اور اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ کاردار ایسے جاہل اور کوڑ آدمی کو اُن کے مکالموں میں ترمیم کا حق نہیں پہنچ سکتا۔ بالآخر کھیمکا نے آغا صاحب کو یقین دلایا کہ آئندہ وہ اُن کے مکالموں کی مدافعت خود کرے گا۔ اور کاردار کو کسی قسم کی کانٹ چھانٹ کی اجازت نہیں دے گا۔ اُس کے بعد "عورت کا پیار" جہاں تک میرے حافظے کا تعلق ہے آغا صاحب ہی کی بتائی ہوئی گرامر کے مطابق بنتی رہی۔ اور ہدایت کار ہوتے ہوئے بھی اس فلم میں کاردار کا کردار ثانوی صورت اختیار کر کے رہ گیا۔ میرے اندازوں کے مطابق زیرِ تکمیل تصویروں میں کاردار کی اس دَور کی بہتر اور فلمی گرامر کے لحاظ سے زیادہ قابلِ قبول فلم "چندر گپت" تھی۔ مناسب مکالموں کی وجہ سے اس فلم کے اداکاروں کو جن میں قابلِ ذکر لوگ گل حمید اور نذیر تھے۔ فلمی اداکاری کے مواقع زیادہ میسّر تھے۔ اس فلم میں مقابلتاً فلمیت زیادہ اور تھیٹریت کم تھی۔ خاص طور پر نذیر اور گل حمید کی اداکاری جنھوں نے چندر گپت موریا اور چانک کے کردار ادا کئے تھے خاصی حد تک متناسب اور SENSITIVE تھی لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود مجھ کو دیوکی بوس کے سیٹ پر فنِ فلم کی جن باریکیوں کو جاننے کا موقع ملا، کاردار کی شوٹنگوں میں ایسے NUANCES اور SUBTLITIES سے آشنا ہونے کا اتفاق بہت ہی کم رہا۔ دیوکی بوس کو میں نے زندگی کے زیادہ قریب پایا اور اس کے رجحانات میں MELODRAMATIC قسم کے عناصر کو اکثر مفقود دیکھا۔ مجموعی APPROACH کے لحاظ سے بھی دیوکی بوس میں ایک خاص انفرادیت اور سنجیدگی تھی۔ انسانی نفسیات کا طالب علم ہونے کے سبب وہ ہمیشہ اپنے طے شدہ کیریکٹرز کے ذہنوں میں اُتر جانے کی کوشش میں رہتا اور حتی الامکان اپنے کیریکٹرز کے ذہنوں کی صحیح عکاسی کرتا۔ میرے نکتۂ خیال سے دیوکی کی اسی نہج کی تصویروں میں "ودیا پتی" ایک عظیم تصویر تھی۔ اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تصویر صرف انسانی نفسیات کی ترجمانی کے لحاظ ہی سے نہیں بلکہ فنِ فلم کی SYNTHETIC نیچر کے لحاظ سے بھی اس دَور کی ایک عظیم فلم تھی۔ مضمون سے اداکاری، تدوین، میوزک، سیٹوں اور آرائش کی حد تک دیوکی نے اس فلم میں بڑی باریک بینی اور حسن کاری سے کام لیا تھا۔ بالخصوص اُس کے چند MOBILE SHOTS غایت درجہ بامعنی اور غیر معمولی تھے۔ یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ

اختری فیض آبادی

اپنے نغموں کی طرح

خود بھی حسین تھی

VISUALS کی اپنی ایک مخصوص منطق ہوتی ہے ایک گرامر اور ہر SHOT کہانی کے THEMETIC CONTENT کے لحاظ سے ایک خاص مقصد ایک خاص تسلسل کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر کوئی SHOT اپنے بنیادی مضمون کے لحاظ سے ان کی مرئی منطق کے رشتے میں نہیں پرویا جاتا تو وہ نکتہ بیں نظر کے لئے قطعاً پیوند کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ بات یا باریکی مجھ کو پہلی بار دیوکی کے ساتھ کچھ دن رہنے اور اس کی شوٹنگ اٹینڈ کرنے میں معلوم ہوئی۔ اس سے پیشتر دُوسرے ہدایت کاروں میں میں نے اس وضع کی نکتہ بینی قطعاً نہیں دیکھی تھی۔

دیوکی بوس کے علاوہ کلکتہ میں مجھ کو کچھ دن بروا کو کام کرتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا۔ بروا بھی اُسی زمانے کا ایک غیر معمولی ذہین اور نکتہ رس ہدایتکار تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ برہمو سماج تحریک کے حامیوں میں سے تھا۔ اِسی لئے اس نے برہمو سماج تحریک کے عظیم افسانہ نگار اور ناول نویس سرت چندر چیٹرجی کے ناولوں کو فلمانے کا کام خاص طور پر اپنے ذمے لیا تھا۔ سرت چندر چیٹرجی کی طرح، بروا کے نزدیک بھی، معاشرے میں عورت کا کردار بہت اہم تھا اور اس کے نزدیک بھی عورت ایک DYNAMIC شخصیت کی حامل تھی۔ لہٰذا اسی وجہ سے بروا کی فلموں میں اکثر اوقات، عورت محبت کا مرکز ہی نہیں ہوا کرتی تھی۔ بلکہ محبت کا سرچشمہ بھی تھی جس کی محبت سے بیریز عظمت معاشرے کی اصلاح کا موجب تھی۔ دیوکی بوس کی عورت کے مقابلہ میں جو زندگی کے ٹھوس حقائق سے اُبھر کر انھیں ٹھوس حقائق سے وابستہ رہتی تھی۔ بروا کی عورت ایک IDEALIZED شخصیت ہوا کرتی تھی اور اکثر اوقات کسی نہ کسی مقام پر پہنچ کر وہ دیویوں کا روپ بھی دھار لیا کرتی تھی۔ یا یہ کہ وہ مابعد الطبیعاتی وضع کی ایک چلتی پھرتی مورتی بن کے رہ جایا کرتی تھی۔ بروا کے دیوداس کی چمنا، دیوداس سے محبت کرتے ہوئے بھی اس سے دور رہنے اور پتی ورتا بننے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ لیکن ودیا پتی کی کاتن بالا اپنے شوہر کے ہوتے

ہوتے بھی خاصی حد تک اور کھلے بندوں، اپنے شاعر محبوب یعنی ودیا پتی کی پرستار بن کے رہ گئی تھی۔ اور جگہ جگہ اس کے راستوں میں بچھ جایا کرتی تھی دلیو کی کے مقابلے میں بروا عورت کے حق میں خاص طور سے جھکا ہوا معلوم ہوتا تھا فلم کے باہر بھی ان دونوں ہدایت کاروں کے قول و فعل بہت مختلف تھے۔ دلیو کی کے نزدیک عورت برابر کا حق رکھتے ہوئے بھی راہ حیات میں صرف ایک ہم سفر کی حیثیت رکھتی تھی اور یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ کوئی خاص عورت ہو۔ لیکن بروا کے لئے عورت ایک رہبر تھی جس کی آنکھوں میں اس کو کچھ ما فوق الفطرت قسم کی روشنیاں نظر آتی تھیں۔ شاید اسی اعتقاد اور یقین کے لحاظ سے بروا نے نہ صرف فلموں ہی میں بلکہ نجی زندگی میں بھی اپنی ہیروئن جمنا کو کافی حد تک IDEALIZED کر رکھا تھا۔

بہرحال ان دونوں عظیم ڈائریکٹروں اور فنکاروں کے ساتھ رہنا اور ان کو کام میں مصروف دیکھنا ایک درس تھا۔ اور اس کے برعکس یہ مجبوری کرانی کے ساتھ کام کرنا میرے لئے سوہان روح ہو کے رہ گیا تھا۔ مگر زندگی کے تقاضے شام و سحر سر پہ سوار تھے۔ اور کرانی کی ٹیم کو باوجود تمام نفرتوں کے میرے لئے برداشت کرنا لازمی تھا۔ لہٰذا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ کرانی کی جب شوٹنگ نہ ہوتی تو میں دیو کی یا بروا کے آس پاس منڈلاتا رہتا اور جب یہ بھی نہ ہوتا تو پھر میں مشہور مغنیہ اختری فیض آبادی کے نغموں کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا۔ اختری بھی اس زمانے کی مشہور ہیروئن تھی اور ایسٹ انڈیا کی مختلف تصاویر میں کام کر رہی تھی۔ اختری اپنے نغموں کی طرح سے خود بھی حسین تھی۔ اور نہ گاتے ہوئے بھی اکثر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ گا رہی ہے اور اس کے انگ انگ سے نغمے برس رہے ہیں۔ اختری کے حق میں میرے اُن ایام کے کچھ اسی طرح کے تاثرات تھے اور ان کو بھی شمعیں سمجھ کر میں دن رات لئے لئے پھرتا رہتا تھا۔ جانے پھر ایک دن ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا کہ میں کسی کام کی وجہ سے میک اپ کے کمروں کی طرف چلا گیا۔ جو ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ میں نے عمارت کے بین دروازہ میں جیسے ہی قدم رکھا، اختری اپنے خاص میک اپ روم کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ اس نے دیکھتے ہی اشارہ کر کے مجھ کو اپنے پاس بلایا۔ پہلے تو میں مبہوت ہو کے رہ گیا تھا۔ مگر فوراً ہی حواس درست کر کے اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھ کو اپنے میک اپ روم میں لے گئی۔ اور ایک صوفے پر بٹھلا دیا۔ اور پھر وہ خود اپنی سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئی اور دبے لفظوں میں مجھ سے پوچھنے لگی کہ میں اس کو خاص خاص نظروں سے کیوں دیکھا کرتا ہوں۔ میرے رگ و پے میں اس وقت بھی کچھ اُسی قسم کی بجلی کی لہر دوڑ گئی جس کا احساس بمبئی میں سائیس کی حسین بیٹی کو دیکھنے پر مجھے ہوا تھا۔ کچھ دیر جب بدحواسی کی وجہ سے میں کچھ نہ کہہ پایا تو اختری نے مجھ سے پھر اپنا سوال دہرایا۔ بہرحال اس وقت جواباً میں یہی کچھ کہہ سکا کہ اس کے نغمات کا مجھ پر گہرا اثر ہے۔ اس نے مسکرا کر فوراً کہہ دیا کہ میں شرما رہا ہوں۔ اور جو کہنا چاہتا ہوں نہیں کہہ رہا۔ یہ سنکر میری بدحواسی اور بے چینی پھر سے بڑھ گئی اور نتیجتاً اب کے تو میں بالکل ہی لاجواب اور خاموش ہو کے رہ گیا۔ اختری نے بھی چند لمحوں کے لئے خاموشی اختیار کر لی۔ اور پلٹ کر میز پر پڑے ہوئے میک اپ کے سامان کا جائزہ لینے لگی۔ کچھ لمحوں کے بعد پھر اس نے مدھم آواز میں داغ کا شعر گانا شروع کر دیا۔

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں
ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

شعر گا لینے کے بعد اختری شاید اس توقع میں تھی کہ میں اس کے اشارہ اور شعر کی باریکی کو سمجھ کر کچھ ضرور کہوں گا۔ مگر میں بہت ہی کوڑ ثابت ہوا۔ نہ میں نے اس کا اشارہ سمجھا نہ شعر کی باریکی کا اندازہ لگایا۔ اور خاموش بیٹھا رہا۔ اختری نے ایک بارگی مجھے دیکھا اور کہنے لگی داغ کے شعر سے تم کو میں یہ جتانا چاہتی تھی کہ تمہاری طرف سے اپنے سوالات کے جواب بھی خود مجھی کو دینے ہوں گے۔ تو پھر کیا خیال ہے میں اپنے سوالات کا جواب خود ہی دے دوں۔ میں نے کسی طرح خود کو بحال کر کے کہدیا جی ہاں، اس نے فوراً کہا اگر یہ سنا ہے تو تم کو میرے گھر پہ آنا ہوگا۔

میں نے دبے لفظوں میں اس سے گھر پہ ملنے کا وعدہ کیا اور اٹھ کر کمرہ سے نکل آیا۔ میں اُس وقت یہ قطعاً بھول چکا تھا کہ میک اپ رومز کی طرف میں کس کام کی وجہ سے آیا تھا۔

(باقی آئندہ)

نیویارک کو مجرموں سے بچانے کا دعویدار مجرموں کا نشانہ بن گیا

تین گولیاں سنسناتی ہیں، خوش پوش نوجوان لڑکھڑا کر نیچے گر پڑتا ہے



سرمایہ دار معاشرے کا دوسرا رُخ

نور الف

پیشہ ور عورتوں نے مغربی جرمنی کے ایک سابق وزیر کو لوٹ لیا

نیویارک۔ کا ملٹن ہوٹل روشنی میں جگمگا رہا ہے۔ ہر دو سیکنڈ کے بعد نئے ماڈل کی اعلیٰ اور نفیس گاڑیاں ہوٹل کے دروازے پر رکتیں اور اونچی سوسائٹی کا کوئی نمائندہ بڑے ٹھسے سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہو جاتا۔ اندر رنگ و بو کی ایک دنیا آباد ہے۔ باہر روشنی کا سیلاب بہہ رہا ہے۔ ہلٹن ہوٹل کے بالکل سامنے ایک بڑی سی گاڑی کھڑی ہے۔ اس کے اندر تین افراد بیٹھے ہیں۔ تینوں نے اوور کوٹ پہن رکھے ہیں۔ ہاتھ میں سیاہ رنگ کے دستانے ہیں۔ اور ان کا نصف چہرہ فیلٹ ہیٹ میں چھپا ہے۔ خاصے پُراسرار اور خطرناک نظر آتے ہیں۔ چوتھا آدمی جو شاید اس گاڑی کا ڈرائیور ہے گاڑی سے باہر نکل کر فٹ پاتھ کے قدرے نیم روشن گوشے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے منہ میں ایک بڑا سا سگار دبا ہے۔ جسے وہ بار بار چیونگم کی طرح کچلتا جا رہا ہے۔ ٹھیک نو بجے ایک گاڑی ہلٹن ہوٹل سے کچھ فاصلے پر رکتی ہے۔ اور اس میں سے ایک خوش پوش نوجوان باہر نکلتا ہے۔ چہرے مہرے سے وہ ایک شریف آدمی نظر آتا ہے۔ اس کا رُخ ہلٹن ہوٹل کی جانب ہے۔ اس آدمی کو دیکھ کر پراسرار گاڑی فوراً حرکت میں آتی ہے۔ ہوٹل کا دروازہ مشکل سے نصف فرلانگ رہ گیا ہے وہ خوش پوش نوجوان اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے خبر ہے اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہو گی کہ اس کے عقب میں لگی ہوئی گاڑی اس کی موت کا پیغام بن کر آ رہی ہے وہ نپے تلے انداز سے قدم اٹھاتا ہوا ہوٹل کی جانب بڑھ رہا ہے۔ ہوٹل اور اس کے آدمی کے درمیان فاصلہ ختم ہو گیا۔ وہ سیڑھی پر قدم رکھنے والا تھا کہ اچانک عقب سے آتی ہوئی پراسرار گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ اور اس کی کھڑکی سے تین فائر کئے گئے۔ رائفل کے منہ سے نکلی ہوئی تین گولیاں سنسناتی ہوئی اس آدمی کی پشت میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گر تا ہے۔

ہلٹن ہوٹل کے باہر جگمگاتی ہوئی فضا اور رنگ و بو کے سیلاب میں ڈوبا ہوا ماحول ایک مرتے ہوئے انسان کی دلخراش چیخوں سے لرز کر رہ گیا۔ تیز تیز بھاگتی ہوئی ایک دنیا، لمحہ بھر کے لئے ٹھہر گئی۔ خوش پوش اجنبی نوجوان شدید زخمی حالت میں چند تانیے بے آب مچھلی کی طرح تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ سکتے کے عالم میں ٹھہری ہوئی دنیا، چہروں پر سوالیہ نشان لئے ہوئے انسانوں کا ایک ہجوم، چند لمحوں کے بعد اس جگہ سے آگے روانہ ہو گیا۔ ایک آدمی ہی تو قتل ہوا ہے۔ کوئی قیامت تو نہیں آ گئی۔ ایسے واقعات تو روز ہی نیویارک کی سڑکوں پر رونما ہوتے ہیں۔ اس عالیشان شہر میں انسانوں کے قتل کا واقعہ بہت معمولی اور روزمرہ کا واقعہ ہے۔ ایسی انوکھی اور انہونی بات نہیں کہ فضول اپنا قیمتی وقت ضائع کیا جائے۔

پولیس آئی۔ موقع واردات کی تفتیش کی گئی۔ عینی گواہوں کے بیانات قلم بند کئے گئے۔ شور مچاتی ہوئی ایمبولنس گاڑی آئی اور لاش اٹھا کر روانہ ہو گئی۔

لاش کس کی تھی۔؟

نیویارک کے ایک شریف شہری کی۔

اُسے کیوں قتل کیا گیا؟

اس نے نیویارک میں بڑھتی ہوئی فحاشی اور پیشہ ور عورتوں اور ان کے دلالوں کے خلاف ایک مہم شروع کی تھی۔ اس نے کہا تھا "نیویارک پیشہ ور عورتوں اور خطرناک مجرموں کی زد میں ہے اگر انہیں روکا نہیں گیا تو اس شہر کی کوئی عورت اپنی پاک دامنی کی قسم نہ کھا سکے گی۔ نیویارک مجرموں کا شہر بن جائے گا۔ یہ خطرناک مجرم عورتوں کو زبردستی بُری صحبتوں پر مجبور کرتے ہیں۔ اور ان کی کمائی پر گذارہ کرتے ہیں۔ پیشہ ور عورتوں کو ان کے چنگل سے نکالا جائے۔ اور انہیں باعزت زندگی گذارنے کا موقع دیا جائے۔"

نیویارک کی پیشہ ور عورتوں کے دلالوں نے اس شریف شہری کو قتل کر دیا۔ نیویارک پولیس ان مجرموں کو پکڑنے میں ناکام رہی۔ کیس داخل دفتر کر دیا گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اس واقعہ سے چند ماہ بعد مغربی جرمنی کابینہ کا ایک سابق رکن نیویارک گیا۔ اسے اسٹریٹ گرلز نے گھیر لیا۔ اس نے اس کے نرغے سے نکلنے کے لئے بہت ہاتھ پیر مارے مگر اس کی ساری جدوجہد ناکام ہو گئی۔ پیشہ ور عورتیں اسے اٹھا کر ایک طرف لے گئیں۔ اور اس کے پاس جو کچھ تھا اُس سے چھین لیا۔ لوٹ لیا۔ اس نے مزاحمت کی تو اسے تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ پولیس کو بیان دیتے ہوئے اس نے کہا۔ "میری زندگی کا تکلیف دہ واقعہ ہے۔ عجیب شہر ہے۔ قانون مفلوج اور پولیس تماشائی ہے۔"

نیویارک بڑا شہر ہے۔ خوبصورت اور متمول شہر ہے۔ چچا سام کے اس شہر میں ہر بات جائز ہے کیف و مستی کی ایک دنیا ہے۔ ہر چیز بکتی ہے اور ہر چیز دولت سے خریدی جاتی ہے۔ جن کے پاس بے اندازہ دولت ہے وہ لاکھوں میں سودا کرتے ہیں۔ جن کے پاس کم دولت ہے وہ ہزاروں کے مال پر خوش ہیں۔ یہ شہر رات کو جاگتا ہے اور دوپہر کو اونگھتا ہے۔ صبح کو اس کے فٹ پاتھوں پر، سڑکوں، ہوٹلوں اور گلیوں میں رات کی داستانیں باسی پھول کی طرح بکھری ہوتی ہیں۔ پورا نیویارک ان دنوں "رات کی بیگمات" کے نرغے میں ہے۔

"رات کی یہ بیگمات" اپنے مخصوص علاقے چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں پھیل جاتی ہیں۔ ان کے پیچھے ان کے محافظ، خونخوار اور چھٹے ہوئے بدمعاش ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ پولیس انہیں دیکھ کر منہ چھپا لیتی ہے۔ شوقین مزاج شہری ان کے ہاتھوں لٹنے کے بعد کفِ افسوس ملتے ہیں۔ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کیونکہ بھنڈا ہونے کے بعد انہیں اس سے زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ نیویارک کا ایک علاقہ مین ہاٹن ان کی سرگرمیوں کے لئے رات کا محتاج نہیں۔ دن کی روشنی میں چچا سام کی تہذیب ننگی ہو کر رقص کرتی ہے۔ انسانیت شرمسار ہو کر رہ جاتی ہے۔ دنیا بھر کو اپنے قدموں میں جھکانے والا سامراج خود اپنے ملک کے مجرموں کے قدموں میں گرا ہوا ہے۔

دن کی روشنی میں مین ہاٹن کے علاقے میں چلے جائیے پھیکے چہرے، زرد رخسار اور آنکھوں میں بے پناہ درد کا احساس سمیٹے، گاہکوں اور راستہ چلنے والوں سے زبردستی کرنے والی عورتوں کا ہجوم ملے گا۔ یہ ساری عورتیں، نیویارک کی بیگمات، مشین کے پرزے کی طرح جرائم پیشہ افراد کے اشاروں پر حرکت کرتی نظر آئیں گی اگر وہ اپنے دلالوں اور ایجنٹوں کی مرضی کے مطابق کام سے انکار کرتی ہیں تو سلاخیں گرم کر کے ان کے جسم کو داغدار کر دیا جاتا ہے۔ ان کی ساری آہیں اور فریاد بے اثر جاتی ہیں۔ کوئی ان کی مدد کو نہیں آتا۔ ان کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ خاموشی سے وہی کام کریں جس کا حکم ان کے سرپرست دیں۔ رات کی بیگمات کا لباس عجیب و غریب اور فیشن ایبل ہوتا ہے۔ ایسا لباس جسے پہننے کے بعد بھی جسم کے بعض حساس اور نازک حصے نظر آتے ہیں۔ دکان کھولنے سے پہلے دکان کی ہر طرح سے سجاوٹ کی جاتی ہے۔ گاہکوں کو پرچانے کے لئے جسم کا جب خرید و فروخت شروع ہو جائے تو پھر یہ جسم بھی دکان بن جاتے ہیں۔ گاہکوں کو بھی آسانی رہتی ہے۔ مول تول کرنے سے پہلے "مال" کو پسند یا ناپسند کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ دیوار یا کیواڑ کے سہارے کھڑی ہوئی یہ عورتیں کہیں کی ہوں؟ امریکہ کی، یورپ کی یا ایشیا کی، ایک جیسی ہوتی ہیں۔ عورت ہوتی ہیں۔ جن کی نسوانیت اور حیا بکتے بکتے ختم ہو جاتی ہے۔ بے حس اور انتہائی ڈھیٹ۔ ان کے اندر اچھے اور بُرے کی تمیز مٹ جاتی ہے یہ اپنے جسم کے جراثیم دوسرے جسم میں منتقل کر کے اپنی زخمی روح کا انتقام لیتی ہیں۔

نیویارک میں اس سال گذشتہ چند سالوں کے مقابلے میں عورتوں کے غیر قانونی کاروبار میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ اسی شرح سے سیاحوں، تاجروں اور سیدھے سادے شہریوں کو لوٹنے اور انہیں قتل کرنے کے واقعات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ دو ہفتہ قبل شہر کی ایک عدالت کے جج نے دو بدنام عورتوں کو ضمانت پر رہا کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے لکھا "میڈ ٹاؤن کا علاقہ ان کی مذموم سرگرمیوں کی وجہ سے بدتر حالت کو پہنچ گیا ہے۔ انہیں ضمانت پر رہا کرنے کا مطلب دوبارہ انہیں پھر پرانی سرگرمیاں بحال کرنے کا موقع دینا ہے۔" جج کے اس فیصلے کے خلاف ویمن لبریشن تنظیم نے زبردست مظاہرہ کیا اور گرفتار عورتوں کو ہر طرح سے مالی امداد دی گئی۔ یہاں تک کہ وکیل اور بیرسٹر بھی مقدمہ لڑنے کے لئے پیش کئے گئے۔ جج کی جان مصیبت میں پھنس گئی۔ حقوق آزادی نسواں کا کہنا ہے کہ "مرد عورتوں کا استحصال کرتے ہیں۔ انہیں



گھر سے اٹھا کر بازار میں پہنچا دیتے ہیں - اور پھر اُن کے ساتھ بہیمانہ سلوک کر کے، اپنی وحشیانہ جبلت کی تسکین کرتے ہیں۔" لیکن تنظیم کے اس اعلان کا اثر شہر کے میئر جان لینڈسے، پر مطلق نہ ہوا اور جب خواتین مظاہرہ کر رہی تھیں تو وہ شہر کے ایک علاقہ میں کسی مذہبی تقریب کا افتتاح کرنے میں مصروف ہے

نیویارک کے بے شمار علاقوں اور محلوں میں رات کی بیگمات کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے پیش نظر عصمت فروشی کی روک تھام کے لئے ایک نیا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا ہے - ایک گشتی فورس بھی قائم کر دی گئی ہے - جس کے آدمی سادہ کپڑوں میں گھومیں گے - اور بازار حسن سے تعلق رکھنے والی عورتوں اور بدمعاشوں کی سرکوبی کریں گے - ان کے پاس کیمرہ بھی ہوگا - کسی عورت کو غیر شریفانہ حالت میں دیکھیں گے تو فوراً اس کی تصویر اتار لیں گے تاکہ عدالت میں ان کے خلاف پکے ثبوت مہیا کئے جا سکیں -

اخلاقیات کے ایک ممتاز پروفیسر کا خیال ہے کہ "تشدد اور ہراساں کرنے والے ہتھکنڈوں سے یہ کاروبار ختم نہ ہوگا - نیویارک پولیس آج تک جرائم کی بیخ کنی میں محض اس لئے ناکام رہی ہے کہ ان مظلوم عورتوں کو اس گھناؤنے کاروبار سے الگ کرنے کے لئے تشدد کا طریقہ اختیار کیا گیا - یہ عورتیں مظلوم ہیں - ہماری ہمدردی کی مستحق ہیں - انہیں سماج میں جگہ نہیں دی جاتی - اگر انہیں اس بات کی گارنٹی مل جائے کہ کاروبار ختم کرنے کے بعد انہیں معاشرے میں شریفانہ زندگی بسر کرنے کے مواقع ملیں گے تو میرا خیال ہے کہ پیشہ ور عورتوں کی تعداد نصف رہ جائے گی - اس کے علاوہ ان کی سرپرستی کرنے والے اصل مجرم ہیں جو انہیں اس مذموم اور غیر اخلاقی حرکت پر مجبور کرتے ہیں - پولیس کو سب سے پہلے ان کا قلع قمع کرنا چاہیئے - جبھی جا کر یہ کاروبار ختم ہوگا تشدد اور ہراساں کرنے کا ہتھکنڈہ فرسودہ اور انتہائی غیر انسانی ہے - جرائم کی بیخ کنی سائنٹیفک طریقہ سے کرنی چاہیئے - عصمت فروشی سے تعلق رکھنے والی عورتوں کو گرفتار کرنے اور انہیں جیل بھیجنے سے معاملہ رفع دفع نہ ہوگا - جیل سے نکلنے کے بعد وہ دوبارہ اپنا دھندا شروع کر دیں گی - اگر سائنسی طریقہ اختیار نہ کیا گیا تو جو ماضی میں ہوتا آیا ہے وہ مستقبل میں بھی پابندیوں کے بعد جاری رہے گا۔"

شہنشاہ حسن

پیغام

حسرت آتی ہے کبھی کوئی نوازش تو کرو
یعنی اُن میری وفاؤں کی ستائش تو کرو

بند الفاظ میں سب کچھ تو بتا یا تھا تمہیں
کاش وہ بات سمجھنے کی بھی کوشش تو کرو

قصۂ ساغر و مینا بھی کبھی سن لینا
آج حالِ دلِ آزردہ کی پُرسش تو کرو

ہر کڑے وقت پہ ہم تھے، کہ سنبھالا ہے تمہیں
یہ سمجھ کے ہی کبھی ملنے کی خواہش تو کرو

زورِ تقریر میں بس دیر و حرم یاد رہا؟
کبھی نا کردہ عمل کی بھی نمائش تو کرو

ہاشمی تیغ کی زد پر ہیں غزالانِ حرم
دَم بخوُد دیکھ رہے ہو! کوئی جنبش تو کرو

ابنِ مرُود ہیں پھر درپئے آزارِ چمن
نفسِ سرد کو آب شعلہ و آتش تو کرو



نئی کراچی میں کوئی سرکاری اسکول نہیں ہے۔ کچھ لوگ کاروباری بنیادوں پر اسکول چلا کر غریب عوام کو لوٹ رہے ہیں

نئی کراچی کے والدین پر بھاری فیسوں کا بوجھ

نعیم آروی

'اپوا ایک کاروباری ادارہ نہیں' فلاحی تنظیم ہے۔ اس بات کا بار بار اعلان کیا گیا۔ اسی بنیاد پر ہر سال حکومت اور عوام سے بار بار مالی معاونت کی اپیل کی جاتی ہے اور ہر سال خواتین کی اس تنظیم کی جھولی میں سرکاری گرانٹ اور عطیات کی صورت میں لاکھوں روپے جاتے ہیں۔ مگر اس تنظیم کی نگرانی میں چلنے والے ان گنت فلاحی ادارے خصوصاً تعلیمی اداروں نے کبھی عوام کی فلاح کو پیش نظر نہ رکھا۔ اور ٹھیٹ کاروباری اداروں کی طرح عوام سے سلوک کیا گیا۔ یوں تو اس تنظیم کے ذیلی اداروں کی خون چوسنے والی پالیسی کی بے شمار مثالیں ہمارے سامنے آچکی ہیں، مگر موجودہ ملکی صورت حال کا بہانہ بنا کر اپوا اسکولوں کی فیسوں میں جو بے پناہ اضافہ کیا گیا ہے۔ وہ کاروباری ذہنیت کی بدترین مثال بن گئی ہے۔

نئی کراچی میں اپوا کے دو سکنڈری اسکول چلتے ہیں ایک لڑکوں کا اور دوسرا لڑکیوں کے لئے ایک تیسرا اسکول رہبر ملت بھی کاروباری بنیاد پر چلایا جا رہا ہے پہلے یہ اسکول ٹاؤن کمیٹی کے زیر نگرانی تھا۔ مگر اب اس کے اندر کچھ گھپلا ہو گیا۔ اور اسکول کی ملکیت کے سلسلے میں باقاعدہ تو تکار مار پیٹ، نالش اور فوجداری تک بات پہنچ گئی ہے۔ خیر یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے کہ تین لاکھ کی آبادی میں کسی سرکاری اسکول کے نہ ہونے سے کچھ لوگ تعلیم کے نام پر کسی طرح غریب عوام کا پاجامہ اور قمیض اتارنے کی فکر میں ہیں۔ اپوا ایک فلاحی تنظیم ہے۔ شروع میں عوام کا خیال تھا کہ اس کے ذریعہ ان کے بچوں کو تھوڑی بہت تعلیم مل جائے گی، مگر اس تنظیم نے اسکول کی ابتداہی لوٹ کھسوٹ سے کی۔ عام اسکولوں

> صدر معلم
>
> نئی کراچی کے
>
> کوارٹر سے حیدری
>
> کے عالی شان
>
> بنگلے میں

سے زیادہ فیس رکھی گئیں۔ غیر ضروری فنڈ کے نام سے ہر ماہ سینکڑوں روپے وصول کئے گئے۔ اس بارے میں متعدد بار احتجاج کیا گیا مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

لوگ رو دھو کر چپ ہو گئے۔ کوئی دوسرا اسکول بھی نہیں ہے کہ بچوں کو اپوا اسکول سے ہٹا کر دوسرے اسکول میں ڈال دیں اپوا والوں کو عوام کی اس کمزوری کا علم ہے۔ چنانچہ من مانے طریقہ سے فیس وصول کی گئی۔

اس ہفتے اپوا اسکول نے طلباء میں ایک پمفلٹ تقسیم کیا۔ جس میں والدین سے اپیل کی گئی کہ چونکہ اس مرتبہ حکومت نے سرکاری امداد برائے نام دی ہے اس لئے اب صورت حال یہ ہے کہ یا تو تعلیمی ادارے بند کر دیئے جائیں یا تعلیمی فیس میں اضافہ کر دیا جائے۔ چنانچہ ایجوکیشن بورڈ، اپوا کراچی برانچ نے اسکول کو زندہ رکھنے کے لئے فیسوں میں ناقابل برداشت حد تک اضافہ کر کے نئی کراچی والوں کو لب گور کر دیا علاقہ کے پریشان حال باشندے ایک اذیت ناک کش مکش میں مبتلا ہیں کہ کیا کریں۔ اپنے بچوں کو اسکول سے اٹھا لیں۔ یا ان کی تعلیم جاری رکھیں اگر جاری رکھیں تو ہر ماہ اتنی بھاری فیس وہ کہاں سے لائیں؟

اپوا اسکول کی پرائمری کلاسوں میں ایکدم سے پچاس پچاس پیسوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ خیر یہاں کے مفلوک الحال باشندے ان پچاس پیسوں کو بھی کسی نہ کسی طرح بھگت لیں لیکن چھٹی کلاس سے لے کر دسویں کلاس تک تین تین چار چار روپے کا اضافہ کسی طرح بھگتیں۔ اس

بجٹ ـــــ بالآخر غریبوں پر بجلی بن کر گرنے لگا

اسکول کی فیسیں پہلے ہی زیادہ تھیں۔ بجٹ کے اعلان کے بعد تعلیمی فیسوں میں یہ اضافہ سب سے بازی لے گیا اس اضافہ کا تقابلی جائزہ ضروری ہو گیا، کراچی انتظامیہ اور خاص کر بجٹ ۷۲-۱۹۷۱ کے خالق جناب ایم ایم احمد اپنی آنکھوں سے اس کی فتنہ سامانی دیکھ لیں۔ اور سمجھ لیں کہ یہ بجلی غریب کی جھونپڑی پر گری ہے۔ اس ملک کے غریب ہمیشہ سے قربانی دیتے آئے ہیں اور اس بار بھی وہی آگے ہیں۔ بڑے لوگ اور بڑی بڑی متمول کاروباری تنظیمیں اپنا خسارہ بھی عوام کا خون چوس کر پورا کرنے میں لگے ہیں

اپوا اسکول نئی کراچی کی چھٹی کلاس کی فیس پہلے ۶ روپے ۱۵ پیسے تھی۔ اب ۸ روپے ۱۵ پیسے کر دی گئی ساتویں کی فیس ۶ روپے ۱۵ پیسے تھی اب ۹ روپے ۱۵ پیسے کر دی گئی اس طرح آٹھویں کلاس کی فیس ۷ روپے ۱۵ پیسے تھی جو ۱۰ روپے ۱۵ پیسے کر دی گئی۔ نویں کی فیس ۸ روپے ۲۵ پیسے سے بڑھا کر ۱۲ روپے ۲۵ پیسے اور دسویں کلاس کی فیس کچھ خیال کئے بغیر ۹ روپے ۲۵ پیسے سے ۱۳ روپے ۲۵ پیسے کر دی گئی۔ یہ ہے اس تعلیمی ادارے کا کاروباری نقطہ نظر جسے بڑی بڑی روشن خیال بیگمات عوام کی فلاح و بہبود کے پیش نظر چلاتی ہیں۔ اور عوام کی معاشی پسماندگی اور تعلیمی کمی پر اپنی ہرانٹر کانٹیننٹل اور میٹروپولی تقریب میں آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں۔

۱۴۸۶

محترم والدین۔ السلام علیکم

جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے کہ ہماری حکومت کو آجکل دیگر پریشانیوں کے علاوہ متعدد مالی مشکلات کا بھی سامنا ہے اس لئے ہم سب کا فرض ہے کہ اس مشکل وقت میں ہر طرح حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں اور مالی مشکلات کو کم کرنے کے لئے بھی ہر طرح انتظامیہ کی مدد کریں۔

اپوا کراچی برانچ کو چونکہ انہیں مشکلات کی وجہ سے امسال سرکاری مالی امداد برائے نام ملی ہے اس لئے اب صورت حال یہ ہے کہ یا تو تعلیمی ادارے بند کردئے جائیں یا والدین اس مشکل وقت میں ادارے اور انتظامیہ کا ہاتھ بٹائیں اس لئے بہت غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ تعلیمی فیس میں اضافہ کردیا جائے اور مندرجہ ذیل طرح سے اگست سے یہ فیس واجب الادا ہوگی۔ امید ہے کہ آپ اس مشکل وقت میں ادارے کی مدد فرمائیں گے ورنہ بصورت دیگر ہمیں مجبوراً ادارہ بند کردینا پڑیگا۔

مندرجہ ذیل فیس
معہ دیگر فنڈ واجب الادا ہوگی

کلاس	ٹیوشن فیس	دیگر فنڈ	میزان
VI	6/-	2/-15	8/-15
VII	7/-	2/-15	9/-15
VIII	8/-	2/-15	10/-15
IX	10/-	2/-25	12/-25
X	11/-	2/-25	13/-25

کلاس	فیس معہ فنڈ
اول	2·00
دوم	2·50
سوم	3·00
چہارم	3·50
پنجم	4·00

منجانب
ایجوکیشن بورڈ
اپوا کراچی برانچ۔ کراچی

اپوا اسکول کی جانب سے فیسوں میں اس بھاری اضافہ کی تلخی کم کرنے کے لئے جو پمفلٹ تقسیم کیا گیا، اس میں مالی امداد کا رونا رویا گیا ہے۔ اور عوام سے قربانی مانگی گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قربانی دینے کے لئے صرف عوام ہی رہ گئے ہیں۔ اگر اس ملک اور قوم پہ یہ نازک گھڑی آئی ہے تو کیا قربانی کے نام پر عوام ہی کو بکرا بنایا جائے گا۔ اس میں بڑی بڑی نام نہاد فلاحی تنظیمیں اور ادارے ہاتھ نہیں بٹائیں گے۔ کیا اس وقت کچھ دیر کے لئے وہ اپنے کاروباری چلن میں برائے نام تبدیلی کے لئے بھی تیار نہیں؟ اپوا اسکولوں کو ہر سال لاکھوں روپے کا سرکاری گرانٹ ملتا ہے اگر امسال نہ ملا تو اس کے بھنڈار میں کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک دم سے تین تین چار روپے کا اضافہ کر دیا گیا۔ کیا تعلیمی فیسوں میں بے پناہ اضافہ کراچی ایجوکیشن بورڈ کراچی انتظامیہ اور حکومت کے علم میں لا کر کیا گیا ہے آخر اتنا بڑا اور سنگین قدم کس طرح اٹھایا گیا۔؟

نئی کراچی اپوا اسکول کے قیام کے وقت ہی سے طلباء سے بلڈنگ فنڈ، میڈیکل فنڈ، لائبریری فنڈ، اپوا فنڈ اور کئی دیگر فنڈ کی صورت میں ہر ماہ سینکڑوں روپے وصول کئے جاتے رہے۔ بلڈنگ فنڈ کا جواز کیوں پیدا کیا گیا اس کا جواب اپوا والے دیں گے۔ بلڈنگ فنڈ کی رقم اسکول کی عمارت کی تعمیر پہ خرچ کی گئی یا کہیں اور اس کا جواب بھی اسکول کا ہیڈ ماسٹر یا نگران ہی دے سکتی ہیں۔ میڈیکل فنڈ وصول کیا گیا تو کیا طلباء کو طبی سہولت فراہم کی گئی یا صرف اس فنڈ کو حلال کرنے کے لئے اسکول کے کمرے میں ایک خوبصورت کلینک کی تعمیر پر اکتفا کیا گیا۔ اس کا معقول جواب طالب علم ہی دے سکتے ہیں، ہم تو یہاں صرف ایک بات کہنا چاہتے ہیں کہ بالفرض امسال اسکول کو سرکاری گرانٹ نہیں ملا تو اسے بہانہ بنا کر فیسوں میں بھاری اضافہ، ایک فلاحی ادارے کے چہرے پر بدنما داغ ہے۔ جب کہ یہ تنظیم اسکول کو پہلے سے نو پرافٹ، نو گین، کی بجائے پرافٹ ہی پرافٹ کی بنیاد پر چلا رہی ہے۔

جب بات اسکول کی چل نکلی ہے تو صدر معلم کا ذکر خیر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ کسی زمانے میں موصوف نے ایم اے کے امتحان کی تیاری شروع کی تھی، اب معلوم نہیں انہوں نے خیر سے ایم اے کر لیا یا بعد میں اس کی ضرورت محسوس نہ کر کے امتحان پاس کرنے کا خیال ترک کر دیا البتہ ایک بات ان کے متعلق پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ صدر معلم بننے کے بعد اس تنظیم کے مالی وسائل سے پورا فائدہ اٹھایا۔ پہلے وہ نئی کراچی کے ایک کوارٹر ہی میں رہتے تھے، چند سالوں کے بعد اچانک نئی کراچی سے اٹھ گئے۔ اور خبر ملی کہ حیدری میں ایک عالیشان بنگلہ تعمیر کروا لیا اس کی اطلاع بھی یوں ملی کہ ایک دن اسکول کے بچوں کو چھٹی کروا کر اپنے یہاں قرآن خوانی کے لئے لے گئے تھے۔ ممکن ہے اپنے بنگلہ کی پیشانی پر ہٰذا من فضل ربی بھی لکھوا دیا ہو۔ اپنا بنگلہ بنوانے کے ساتھ انہوں نے ایک دوسرا کام بھی کیا۔ اس علاقہ میں صاف ستھری یونیفارم پہن کر آنے والے بچوں کے لئے اسکول بھی کھول دیا۔ صدر معلم اپنا بیشتر وقت اپنے نجی اسکول پر دیتے ہیں۔ اپوا اسکول نئی کراچی میں کم وقت دیتے ہیں۔ بھلا ان جیسے مصروف آدمی کے لئے اتنا وقت کہاں سے آئے گا کہ وہ حیدری جیسے صاف ستھرے ماحول سے نکل کر نچلے متوسط اور مزدور طبقے کی گندی بستی کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دیں۔ موصوف نے بڑے کم وقت میں قابل رشک ترقی کی ہے۔ ممکن ہے ترقی کچھ مدارج ابھی باقی رہ گئے ہوں جس کے لئے وہ اب بھی رات دن کوشاں ہیں۔

روزنامہ غالب سے روزنامہ جنگ تک (۴)

صحافت میاں افتخار الدّین کا ثانی پیدا نہیں کرسکی

افضل صِدّیقی

ایک سال تک یہی معمول رہا کہ صبح دس بجے سے ۴ بجے تک "اسٹار نیوز ایجنسی" میں اسٹینسل پر انگریزی خبروں کا ترجمہ کرتا اور ۶ بجے سے رات ایک دو بجے تک "امروز" کراچی میں دماغ سوزی کرتا۔ اس زمانے میں خون میں گرمی زیادہ تھی اور اپنے آپ سے انتقام لینے کا جذبہ زیادہ شدید تھا۔ اس لئے چودہ چودہ گھنٹے روزانہ مسلسل کام کرتے رہنے کے باوجود نڈھال نہیں ہوتا تھا ایک سال تک امروز میں یہی معمول رہا کہ کوئی نہ کوئی سب ایڈیٹر دو ایک ماہ کی طویل رخصت پر چلا جاتا۔ اور میں اس کے کھاتے کا کام بھگتا تا رہتا۔ یہ بڑی غیر یقینی صورتحال تھی جو کسی وقت بھی ختم ہو سکتی تھی۔ امروز میں کام کرنے والے سارے افراد کو مجھ سے کچھ ایسی ہمدردی اور تعلق پیدا ہو گیا تھا کہ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اخبار میں کام کرنا ترک کر دوں۔ خود فاضلی ابرار صاحب لاہور میں ہیڈ آفس سے میرے بارے میں بات چیت کر چکے تھے مگر مستقل بند و بست کی کوئی صورت نہیں نکل رہی تھی۔ بات یہ تھی کہ کراچی کا "امروز" ہمیشہ خسارہ میں نکلتا رہا۔ اخراجات کے لئے جو رقم ملتی تھی۔ وہ اگرچہ کم تھی مگر وہ بھی اخبار سے وصول نہیں ہو پاتی تھی۔ اس لئے گرانٹ میں اضافہ یا اخبار کی حالت زیادہ اچھی بنانے کے لئے مزید اخراجات کا بار اٹھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے میری گنجائش نہیں نکل رہی تھی۔

میاں افتخار الدین نے کراچی سے امروز نکالنے کو نکال دیا۔ مگر یہ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ سفید ہاتھی بن جائے گا۔ لاہور امروز کے لوگ پہلے ہی اس کے مخالف تھے کہ کراچی سے بھی اخبار نکالا جائے۔ اس رقابت کے کئی اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ ہر سال انہیں جو بونس ملتا تھا۔ وہ کراچی امروز کے خسارہ کے باعث کم ہو جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ باوجود مسلسل خسارے کے میاں افتخار الدین کراچی کے اخبار کو بند کرنے پر اس لئے آمادہ نہیں تھے کہ اس سے کاروباری ساکھ متاثر ہوتی تھی، بند کر دیتے تو اب تک انہوں نے صحافت میں ایک خوشگوار انقلاب کی ابتدا کر کے جو نیک نامی کمائی تھی اس پر پانی پھر جاتا۔ انہیں اس کا گمان بھی نہ رہا ہو گا کہ کراچی سے نکلنے والے دو اخبار جنگ اور انجام، امروز کی اشاعت پر برابر اثر انداز ہوتے رہیں گے۔ امروز کی اشاعت دس پندرہ ہزار سے اوپر نہ جا سکی۔ بلکہ آخری دنوں میں حکومت کے قبضہ میں آ جانے کے بعد تو بہت ہی کم ہو گئی تھی۔ کیونکہ جو لوگ امروز کو مظلوم اور پسے ہوئے استحصال زدہ طبقوں کے ترجمان کی حیثیت سے پڑھتے تھے سرکاری قبضہ کے بعد وہ اس سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ دانشور طبقہ نے بھی جو اگرچہ محدود تھا مگر جنگ اور انجام پر امروز کو ترجیح دیتا تھا۔ یہ اخبار پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اسی لئے امروز ۵ ہزار بھی مشکل سے چھپ سکتا تھا۔ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر ایوب خانی حکومت قبضہ سے پہلے کراچی کے دو اخباروں جنگ اور انجام میں غضب کی رقابت اور مسابقت چل رہی تھی۔ پہلے انجام کی اشاعت جنگ سے زیادہ تھی مگر پھر جنگ انجام سے بازی لے گیا۔ اب جنگ کراچی ہی کا نہیں پورے پاکستان کا سب سے بڑا اخبار ہے۔ پالیسی تبدیلی ہونے کے بعد بھی اس کی اشاعت کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ لوگ جنگ اس لئے پڑھنے پر مجبور ہیں کہ یہ ان کی عادت اور ضرورت بن چکا ہے جس طرح لوگ روٹی کھانے پر مجبور ہیں [illegible] حاجت پر مجبور ہیں اسی طرح جنگ ان کی مجبوری ہے۔ اس مجبوری کو نہ انجام توڑ سکا۔ نہ حریت اور نہ مشرق اور جسارت۔ یہ جسارت کر بھی نہیں سکتا کیونکہ وہ تو جنگ کی بغل ہی سے نکلتا ہے۔ اخبار جنگ کو اس مقام پر لانے میں بلاشبہ اس کے مالک میر خلیل الرحمٰن کی ذاتی محنت، لگن اور دلچسپی کے علاوہ مصلحت اندیشی اور بینی کو زیادہ دخل ہے وہ بہت ہوشیار اور تجربہ کار آدمی ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ اخبار کس طرح چلایا جاتا ہے۔ اخبار کی تقسیم کا کام بہت منظم ہے اس نظام میں پیند لگانے کی کسی کو ہمت نہیں ہوئی۔ کراچی میں کوئی نیا اخبار قدم جمائے تو کس طرح۔ بہت اگر چلے گا تو ۲۰ ہزار، ۳۰ ہزار چھپ جائے گا۔ اس کی یہ اشاعت بھی ابتدائی مہینوں میں رہے گی۔ اخبار کا مالک اور کام کرنے والے پھولے نہیں سمائیں گے کہ وہ بڑا تیر مار رہے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اس اخبار کا بھٹہ بیٹھتا چلا جائے گا اور آخر کار پتہ چلے گا۔ کہ اشاعت ۵ ہزار رہ گئی۔

دراصل اشاعت شروع سے بھی اتنی ہی تھی۔ باقی بیس ہزار اخبار کہیں ٹھکانے لگایا جاتا رہا۔ یہ کام کون کرتا ہے۔ اس سے اخبار میں کام کرنے والا ہر شخص واقف ہے بس ثابت ہوا کہ کراچی میں کوئی اخبار نکل تو سکتا ہے مگر زمین نہیں پکڑ سکتا۔ اخبار کا مالک مالدار ہوا اور کئی کاروباری ادارے اس کے زیر نگیں ہوئے تو وہ اخبار کا مشغلہ بھاری نقصان کے باوجود جاری رکھ سکتا ہے ورنہ ڈھیر ہو جائے گا۔ انگریزی اخبار "سن" کو کراچی سے شائع ہوئے ۱۵ مہینے گذرے ہیں اور یہ اخبار مسلسل خسارے میں چل رہا ہے اشاعت تین ہزار سے ۵ ہزار تک ہے۔ مگر نقصان یوں نہیں کھلتا کہ جو رقم انکم ٹیکس کے محکمے کو دی جاتی وہ اخباری دنیا میں لگا دی گئی۔ حساب برابر ہو گیا۔ روپیہ روپے سے کمایا جاتا ہے۔ آج کل اخبار بھی صنعت بن گیا ہے، اینٹوں کا بھٹہ نہیں لگایا۔ اخبار نکال لیا۔

میں جس زمانے کی بات کر رہا تھا اس زمانے میں اخبار نے صنعت کا روپ نہیں دھارا تھا جنگ اور انجام پاکستان بننے کے بعد۔ دلی سے ہجرت کر کے

جب پولیس نے صحافیوں کے حُلیے نوٹ کئے

کراچی آئے تھے۔ پہلے انجام نے اشاعت کا آغاز کیا۔ یہ دونوں اخبار پہلے ایک مشن رکھتے تھے۔ بالخصوص انجام نے جس کے مالک و مدیر عثمان آزاد مرحوم تھے تحریک پاکستان میں نمایاں طور پر حصہ لیا تھا۔ جو خدمت قائد اعظم کے قائم کردہ "ڈان" نے انجام دی، اس سے زیادہ انجام کی خدمات ہیں کراچی میں بھی جب تک انجام عثمان آزاد صاحب کے پاس رہا اس نے اپنے مشن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ گھڑ دوڑ کی علت کے باوجود عثمان آزاد نے پاکستان بنانے والی مسلم لیگ اور اخبار کے ساتھ اپنی پرجوش وابستگی آخر دم تک برقرار رکھی یہ ان کے کردار کی نیکی اور عزم کی پختگی ہی تھی جس نے ان کو عزت اور عظمت تو دی مگر اضافی دولت نہ دی جسے کارخانوں اور بنکوں میں لگا سکتے۔ انجام کی داستان الگ بیان ہوگی۔

ان دونوں اخباروں کا اس وقت ذکر اس لئے ضروری تھا کہ اس زمانے کی فضا کا خاکہ سامنے آجائے جب کراچی سے امروز ان دو دیو ہیکل اخباروں کی موجودگی میں اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے تھا۔ جس طرح میاں افتخار الدین ہمیشہ حزب اختلاف میں رہے اسی طرح امروز اور پاکستان ٹائمز نے بھی کبھی حکومت وقت کی ہمنوائی نہیں کی۔ اسی لئے خود میاں صاحب اور ان کے اخبارات کسی حکومت کے کاسہ لیس نہیں رہے وہ کھلی دوستی اور کھلی دشمنی کے قائل تھے اور جس بات کو ناجائز سمجھتے تھے۔ اُسے برملا ناجائز کہتے تھے۔ اس پر مصلحتوں کا غلاف نہیں چڑھاتے تھے۔ اس لئے وہ بھی معتوب رہے اور ان کے اخبارات بھی ایوب خاں کی نظریں بھی ان اخبارات پر تھیں جو ملک کی سیاسی لہروں کو بڑے قریب سے دیکھ رہے تھے۔ غالباً وہ ابتدائی مرحلہ ہی پر اپنے انقلاب کے منصوبے میں نپولین کی طرح اخبارات کو کنٹرول کرنے کی اسکیم شامل کر چکے تھے۔ انہوں نے بھانپ لیا تھا۔ کہ اخبارات کو لگام نہ دی گئی تو وہ طویل دور آمریت کی نعمتوں سے بہرہ ور نہیں ہو سکیں گے۔ یہ وقت وہ تھا جب پاکستان امریکہ کی گود میں پوری طرح گر چکا تھا۔ اور معاشی طور پر ملک کی تباہی کا آغاز ہو چکا تھا روس میں ترمیم پسندی کا طوفان نہیں اٹھا تھا۔ اور سن یات سین کا آزاد چین ماؤزے تنگ کی قیادت میں ترقی کی منزلیں سر کر رہا تھا۔ ان دونوں سوشلسٹ ملکوں سے مصلحتاً ہماری دشمنی تھی کیونکہ ہماری خارجہ پالیسی کا محور اس وقت صرف امریکہ تھا۔ جس نے ہشت پا کی طرح پاکستان کی قومی زندگی کو اپنے چنگل میں لے رکھا تھا۔ امروز اور پاکستان ٹائمز کھل کر حکومت پاکستان کی امریکہ نواز پالیسی پر نکتہ چینی کر رہے تھے۔ اور اس سے اس وقت کے "دشمنان پاکستان" چین اور روس کے موقف کو تقویت پہنچ رہی تھی ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان اخبارات کو کب تک آزاد چھوڑا جا سکتا تھا اسی لئے انقلاب اکتوبر ۱۹۵۸ء کے سال بھر بعد ہی ان اخبارات کو حکومت نے اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ اس وقت سے یہ اخبارات حکومت ہی کی زیر نگرانی نکل رہے ہیں۔ حالانکہ ملک کی خارجہ پالیسی پر امریکہ کی گرفت کمزور پڑ چکی ہے۔ اور دشمن

جنگ کا مقابلہ کرنے

والے یہ نہیں جانتے

کہ اُن کا اخبار

کون خریدتا ہے؟

دوست بن گئے ہیں۔ ورنہ وہ زمانہ بھی تھا کہ جب گھروں میں روسی اور چینی لٹریچر رکھنا اور اسکا مطالعہ کرنا بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ امروز میں کام کرنے والوں کی نگرانی کی جاتی تھی۔ ہمیں مستقل طور پر شیڈو کیا جاتا تھا۔ دن بھر رات کو آخری کاپی جانے تک امروز کے دفتر کے نیچے اور سامنے کے ہوٹل میں خفیہ محکمے کے سفید پوش بیٹھے رہا کرتے تھے اور ہر آنے جانے والے پر نظر رکھا کرتے تھے۔ وہ ایک نے کینٹین والے سے یارانہ گانٹھ رکھا تھا کینٹین کے آگے چارپائی بچھی رہتی اور اسی پر بیٹھے ہوئے یہ سفید پوش حقہ گڑگڑایا کرتے اور مفت کی چائے پیا کرتے۔

ایک روز قاضی ابرار صاحب نے امروز کے سارے سب ایڈیٹروں کو ہدایت کی کہ سلامتی چاہتے ہو تو اپنے گھروں سے روسی اور چینی لٹریچر ہٹا دو انہوں نے اوپر کا یہ حکم بھی پہنچایا کہ ہر کارکن اپنا فوٹو لے آئے نہ ہو تو فوراً کھنچوائے پتہ چلا کہ خفیہ محکمے میں سب کا کچا چٹھا تیار ہو رہا ہے۔ ہر ایک کے نام پتے حلیے اور حالات زندگی اور کرتوتوں کے ساتھ فوٹو بھی درکار ہے۔ چنانچہ خفیہ محکمہ کی یہ فرمائش پوری کر دی گئی۔ میں چونکہ باقاعدہ ملازم نہیں تھا۔ بلکہ بے قاعدہ تھا اس لئے اس کھکھیڑ سے میں نے پہلو بچانا چاہا اور مجھے مستثنیٰ بھی کر دیا گیا مگر چار روز کے بعد ایک صاحب گھر پہنچ گئے نام پتہ حلیہ حالات زندگی کب پیدا ہوئے کب مروگے۔ ان ساری تفصیلات کے ساتھ فوٹو بھی جھپٹ کر لے گئے۔ یہ وبال شاید اب بھی اس محکمے کے فائل میں موجود ہوگا۔ میں سمجھتا تھا کہ جرنلسٹ صرف جرنلسٹ ہوتا ہے۔ نہ دایاں، نہ بایاں نہ سوشلسٹ اور نہ اسلام پسند۔ یہی عقیدہ میرا اب بھی ہے۔ اس لئے جب خفیہ محکمے کی عنایتوں کی بارش ہوئی تو مجھے بڑا دکھ پہنچا۔ دکھ اس بات کا کہ ہم نیک نیت ہونے کے باوجود اپنے ہی وطن میں وطن دشمن کیوں گردانے جا رہے ہیں۔ امروز میں جتنے لوگ کام کرتے تھے وہ سب پڑھے لکھے، معقولیت پسند اور پرجوش نوجوان تھے ان کے دل و دماغ کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور دنیا کے ہر خطے میں رونما ہونے والی تبدیلی پر ان کی نظر تھی نظام کہنہ کو بدل دینے کا جذبہ وہ بھی اپنے اندر رکھتے تھے اور یہ کوئی قابل سزا جرم نہیں تھا۔ ان لوگوں میں منہاج برنا تھے جو آج کل پی ایف یو جے کے سیکرٹری جنرل ہیں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہارون سعد تھے جو آج کل امروز لاہور کے ایڈیٹر ہیں آصف جیلانی تازہ تازہ گریجویٹ ہو کر نکلے تھے اور امروز میں رپورٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے آج کل وہ لندن میں جنگ کے نامہ نگار ہیں سید باقر رضوی سینئر سب ایڈیٹر تھے۔ وہ آج کل پی آئی اے کے محکمہ تعلقات عامہ میں کام کرتے ہیں۔ حیدر علی خان امروز کراچی کے بند ہونے کے بعد ہی سے لاہور

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں



افسانہ

اِیثار

مصنف : ولادیمیر بوگومولوف ——— ترجمہ : عبدالمبین خان

ہم دونوں پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے۔ اور اس لمحے ہمیں زمین نہ سرد محسوس ہو رہی تھی، اور نہ ہی سخت اور سیلی ہوئی۔

ہماری ملاقات پانچ ماہ قبل ہوئی تھی جب وہ ہماری رجمنٹ میں آئی تھی۔ اس ملاقات کے بعد ہم ایک دوسرے کے لئے محبوب بن چکے تھے۔ جیسے وہ میرے لئے پیدا ہوئی تھی اور میں اس کے لئے۔ ہم جب تک ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیتے۔ چین نہیں ملتا تھا۔ میری عمر انیس سال تھی اور وہ مجھ سے ایک سال چھوٹی، اٹھارہ سال کی ——— ہم خفیہ طور پر ملتے۔ تنہائیوں میں، سناٹوں میں ——— صرف میں ہوتا اور وہ ہوتی۔ ہماری ان ملاقاتوں کی خبر کسی کو نہ ہوتی۔ کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ ہم محبت کے لافانی رشتوں میں بندھ چکے ہیں۔ کسی کو یہ شبہ تک نہ ہو سکتا تھا کہ ایک تیسرا فرد اب ہماری محبت کی ابدی لطافتوں کا ثبوت بننے والا ہے۔

"میرا دل گواہی دیتا ہے یہ لڑکا ہوگا۔" وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ یہ بات اس نے دسویں بار کہی تھی۔ وہ مجھے خوشبوؤں کی مہکتی فضاؤں میں کھینچتی لئے جا رہی تھی۔ "اور وہ ہوبہو تمہاری شکل کا ہوگا۔"

"لیکن میرا دل کہتا ہے! یہ ضرور لڑکی ہوگی۔ بالکل تمہاری طرح حسین اور شگفتہ۔" میں نے جواباً دھیرے سے کہا لیکن میرے تصورات زقند بھر کر کوسوں دور جا پہنچے تھے تقریباً پانچ سو میٹر دور، سامنے میرے ساتھی مورچوں اور خندقوں میں گہری نیند سو رہے تھے کچھ اور نئے پراگلے مورچوں سے دور، جرمنوں کے مورچے، جو پہاڑی پر کبھی کبھی روشنی سے جگمگا اُٹھتے تھے، گہرے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اندھیرے کی سیاہ اور دبیز چادر نے ان کا احاطہ کر لیا ہو۔ میری کمپنی کو وہ مشن پورا کرنا تھا جس کے لیے ایک ہفتہ قبل دوسری کمپنی انتھک جد و جہد کر چکی تھی۔ اس پہاڑی کی فتح جس پر اب تک جرمنوں کا قبضہ تھا۔ بٹالین میں کوئی اس مشن کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ سوائے پانچ افسروں کے جنہیں رجمنٹ کے کمانڈر نے تمام کو مورچے قائم کرنے کا حکم دیا تھا۔ اپنا حکم پڑھنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا "یاد رکھو جیسے ہی جرمن فائر کریں اور ہری روشنی آسمان پر بلند ہوتی نظر آئے۔ تم پیش قدمی شروع کر دینا۔ تمہارے پڑوسی بھی تمہارا ساتھ دیں گے لیکن تمہیں بہر حال وہ پہاڑی فتح کرنی ہے۔"

میری سوچ پہاڑوں پر گرنے والی برف کی مانند میرے ذہن میں جمع ہو رہی تھی اور ایک ایک گوشے کو یخ بستہ کر رہی تھی ——— وہ میری باہوں میں سمٹی لیٹی تھی۔ مجھ سے بہت قریب اس کی سانسوں کی مہک میرے وجود میں حلاوتیں گھول رہی تھی۔ اور جب میں نے اس کے شعلوں میں تپتے ہوئے لبوں کو چوما تو ہونے والی جنگ کا ہولناک تصور طوفان کی مانند میرے ذہن کے دریچوں سے در آیا۔ لیکن میرا تعلق جنگ سے زیادہ اس سے تھا۔ اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات اور مسائل سے تھا۔ اس کے ساتھ بیتی ہوئی ایک ایک گھڑی سے تھا۔ میں نے اپنا دماغ اپنا ذہن کوئی مناسب حل ڈھونڈ نکالنے کی کوشش پر مرکوز کر دیا۔

"میں اب سونا چاہتی ہوں۔" اس نے دھیرے سے خمار آلود لہجے میں کہا جو شمالی علاقوں کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ "تم جانتے ہو۔ رات کے بعض لمحوں میں، میں سوچتی ہوں، جب صبح اٹھوں گی تو یہ خونیں شب دم توڑ چکی ہوگی۔ یہ خندقیں، خون، موت ...... سب کچھ ختم ہو چکا ہوگا ——— ہم کب تک بارود کا بدبودار دھواں نگلتے رہیں گے؟ ——— دو سال بیت گئے ——— یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے جاری نہیں رہ سکتا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ ——— اس لمحے کا کوئی تصور کرو، اس حسین لمحے کا جب سورج مشرق کی وسعتوں سے جنم لے رہا ہوگا۔ اور جنگ کوئی بھی جنگ نہیں ہوگی۔"

"میں اس وقت میجر کے پاس جا رہا ہوں۔" میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے سر کے نیچے سے نکالا اور کھڑا ہو گیا ——— "میں اسے اپنا تمام کہانی سنا دوں گا ——— تمہیں گھر بھیجنے کی ضرورت ہے ——— فوراً ہی ———"

"کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور میرے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولی۔ "جانے تم کیسے پاگل آدمی ہو ——— کیوں ——— میجر تمہاری کھال کھینچ لے گا۔"

اور پھر وہ رجمنٹ کمانڈر کی ہلکی اور درشت آواز کی نقل اتارتے ہوئے سرگوشی کے لہجے میں بولی "ماتحتوں کے ساتھ جنسی ملاپ قائم کرنے پر کسی بھی یونٹ کی کارکردگی میں اضافہ نہیں ہو جاتا ——— اس سے ایک افسر کے اختیارات ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے ہیں ——— اگر میں کسی افسر کو اس قسم کے معاملات میں ملوث پاؤں تو میں اس کا بستر ہی گول کر دوں، خواہ اس کا عہدہ کچھ بھی کیوں نہ ہو ——— اور اس کے ساتھ ہی اسے ایسا سرٹیفکیٹ بھی دوں گا۔ جو گارڈ ہاؤس کو ہمیشہ اس کا معترف رکھے! جنگ جیتو اور پھر اس کے بعد خوب محبت کرو جس سے بھی تم چاہتے ہو اور جس قدر بھی چاہتے ہو ——— البتہ اس وقت ...... میں تمہیں سخت منع کرتا ہوں۔"

وہ دوبارہ زمین پر لیٹ گئی اور دھیرے دھیرے ہنسنے لگی، تاکہ کوئی دوسرا نہ سن لے ——— مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ کسی پہاڑی کے پہلو سے ٹھنڈے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا ہے اور ترل ترل کرتا بہتا جا رہا ہے ——— میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی ———

میں جانتا تھا کہ میں کس مقصد کے لئے فوج میں تھا۔ میجر بڑا سخت گیر آدمی تھا اور وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ میدان رزم ان اور عورت کی جگہ نہیں!۔

"میں بہر حال اس سے ملنے جا رہا ہوں۔"

"شش۔" وہ اپنے ابھرے ہوئے سرخ گالوں کو میرے گالوں سے رگڑنے لگی۔ پھر کچھ توقف کے بعد وہ سرد آہ بھرتے ہوئے سرگوشی کرنے لگی۔ "میں خود اس کا انتظام کر لوں گی۔ میں نے اس بارے میں خوب سوچ لیا ہے۔ تم باپ نہیں بن سکو گے۔"

"۔ میں باپ نہیں بنوں گا؟" دفعتاً میں نے اپنا خون کھولتا ہوا محسوس کیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"تم کتنے نادان ہو۔" وہ سادگی سے ہنسنے لگی پھر بولی "نہیں۔ بچہ تمہاری شکل سے ملتا جلتا نہیں ہو گا! مجھے یقین ہے۔ میں ہر چیز کی دیکھ بھال کر لوں گی۔ پیدائش کے سرٹیفکیٹ میں دوسری تمام دستاویزات میں تمہارا نام باپ کے خانے میں درج ہو گا۔ لیکن اس وقت میں میجر کو بالکل ہی مختلف کہانی سناؤں گی۔"

وہ شبنم کے قطروں کی طرح پوتر تھی، بے ریا اور ہمیشہ سچائی کو اپنے لبوں پر سجانے والی۔ لیکن اس وقت مجھے اس کی چالاکی بے پناہ پسند آئی

"پھر تم بچے کے بارے میں کیا کہو گی؟"

"ایک آدمی کا جو اب مر چکا ہے۔ باشوف۔"

"نہیں، جو مر چکے ہیں، انہیں اس کہانی میں مت ملوث کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر کینوپاف۔"

سارجنٹ کینوپاف، ایک خوبصورت نوجوان تھا، شراب کا بے حد دھنی۔ ایک مرتبہ چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ اور اس کو فوج سے واپس بھیج دیا گیا تھا۔

میں نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"اوہ۔ اب کچھ تو صبر کرو۔" وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں سے مجھے پرے دھکیلتے ہوئے بولی۔ "تم تو ہمیں کچل کر رکھ دو گے۔" اسے خود کے لئے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے نجانے کیوں مسرت سی محسوس ہوئی تھی "میرے بھولے بھالے محبوب۔ تم کتنے خوش قسمت ہو کر مجھ سے ملے میرے ساتھ رہ کر تم کبھی غلط قدم نہیں اٹھا سکتے۔"

وہ ہنسنے لگی اور پھر لبوں کے کناروں سے موسیقی کی لہریں پھوٹنے لگیں۔ ترنم موسیقی۔

۔ میں خموشی سے اس ترنم اور موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

"سنو۔ تمہیں میجر کے پاس فوراً اور اسی وقت جانا چاہیئے۔"

"اس وقت۔ آدھی رات کو؟"

"میں تمہیں وہاں تک لئے چلتا ہوں۔ تم پوری وضاحت سے اسے سمجھا دینا کہ اب میں یہاں اس کیفیت میں نہیں رہ سکتی۔"

"لیکن یہ سچ نہیں ہے!"

"اوہ پلیز۔ میری خاطر! تم کیسے یہاں رہ سکتی ہو۔ تمہیں چھٹی لینی چاہیئے۔ کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ کل دوران جنگ۔۔۔۔۔؟"

"کل کی جنگ؟" وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ "کیا تم مجھے سچ بتا رہے ہو؟"

"ہاں۔ سچ۔"

وہ دفعتاً خاموش سی ہو گئی۔ اور زمین پر سیدھی لیٹی جانے کیا سوچنے لگی۔ لیکن میں اس کی سانس کی رفتار اور آواز سے جو میرے لئے بہت ہی مانوس تھی، یہ بتلا سکتا تھا کہ وہ ذہنی الجھن میں گرفتار ہے!۔

"ٹھیک ہے۔ کوئی شخص جنگ سے فرار نہیں ہو سکتا" بالآخر وہ بولی "میں بھی نہیں فرار ہو سکتی۔ اگر میں چاہوں بھی تو۔ میڈیکل کمیشن میرا معائنہ کرے گا۔ اور اس کے بعد ڈویژن سے حکم آئے گا۔ اور یہ سب کاروائی کچھ وقت لے گی۔ میں کل ہی میجر کے پاس جاؤں گی۔۔۔ ٹھیک ہے نا؟"

میں کچھ نہیں بولا۔ اس لمحے میرے ذہن میں کچھ کہنے کے لئے الفاظ ہی نہیں تھے۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں!۔" اچانک وہ بولی "اس سے بہتر ہے میں مر جاؤں ہر وقت وہ مجھ سے کہتا رہتا ہے۔ ہمیشہ چست اور وفادار رہنے کی کوشش کرو۔ لیکن میں کیا کر چکی ہوں۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور چہرہ اپنے کوٹ کے آستین میں چھپا کر دھیرے دھیرے سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اس کے خوبصورت چہرے کو، حسین ماتھے کو اور گہری آنکھوں کو چوم لیا جو آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھیں میرے ہونٹ نمکین سے ہو گئے۔

"اب مجھے جانے دو" وہ مجھے دھکیلتے ہوئے بولی۔ "کیا تم مجھے پھر ملو گے؟۔" ہم آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے تنگ اور تاریک کھائی میں اترنے لگے جہاں ہماری بٹالین کا مددگار اسٹیشن واقع تھا۔ میں نے اس کی کمر کو اپنے بازوؤں میں سمیٹا ہوا تھا۔ جو کچھ پھول سی گئی تھی۔ اور جس پر گوشت کی تہہ سی چڑھ گئی تھی۔ میں نے اس کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اور ہر قدم پر اسے سہارا دیتا جاتا تا کہ کہیں پھسل یا گر نہ جائے۔

میں اسے جنگ سے بچا سکتا، کاش۔ اس جنگ سے جو صبح ہونے والی تھی۔ جب وہ میدان میں ادھر ادھر بھاگی بھاگی پھر رہی ہو گی گولیوں کی بوچھاڑ اور بارود کے دبیز دھوئیں میں گرتی اور گر کے سنبھلتی ہوئی۔ جب وہ زخمیوں کو محفوظ جگہوں پہ لے جا رہی ہو گی کاش!۔

پندرہ برس بیت گئے۔ لیکن مجھے سب کچھ اب تک یاد ہے۔ ایک ایک لمحہ، ایک ایک واقعہ۔ جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔

جرمنوں نے سورج نکلتے ہی فائر شروع کر دیا۔ مورٹریں اور بھاری مشین گنیں آگ اگلنے لگیں اور سبز سبز شعلے ہواؤں میں جلنے بجھنے لگے۔

جب سورج بلند ہوا تو میں اپنی کمپنی کے ساتھ اس پہاڑی تک پہنچ چکا تھا۔ جس کی فتح کیلئے ہمارے بے شمار ساتھی جانیں قربان کر چکے تھے۔ آدھ گھنٹے بعد جرمنوں کے بنائے ہوئے ایک پختہ مورچے میں رجمنٹ کا کمانڈر اور کچھ دوسرے مجھے مبارکباد دے رہے تھے میری حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ اور مجھ سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ اور میں۔ میں وہاں لکڑی کے ایک بے جان مجسمے کی طرح کھڑا تھا۔ کچھ محسوس کر رہا تھا اور نہ کچھ سن رہا تھا۔

سورج چمک رہا تھا۔۔۔۔ کاش میں اس چمکتے ہوئے سورج کو واپس افق کے پیچھے دھکیل سکتا! کاش میں پھر صبح کے اولین لمحوں کو پکار سکتا!۔ صرف دو گھنٹے قبل ہم تین نفوس سرگوشیوں میں مصروف تھے آنے والے لمحوں کی المناکیوں سے بے فکر، بے نیاز

لیکن سورج آہستہ آہستہ طلوع ہوتا گیا۔ سنگدلی اور بے رحمی کے ساتھ میں پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا تھا اور وہ۔ وہ مجھ سے دور۔ بہت دور تھی جہاں میں خندق میں مردوں کو دفنانے کے بعد سپاہیوں کو ہٹتے دیکھ رہا تھا!۔ اور کوئی نہیں، کوئی نہیں جانتا وہ مجھ سے کیا تعلق رکھتی تھی اور ہم تین ہو چکے تھے۔۔۔

آدم جی کامرس کالج کی تجارت میں دس ہزار روپے کا نقصان

عبدالحمید چھاپرا

آدم جی سائنس کالج کی گورننگ باڈی نے "کامرس سیکشن" کو بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ (ایک خبر)

آدم جی سائنس کالج کی انتظامیہ نے آدم جی کامرس کالج کے اساتذہ کو ملازمتوں سے برطرفی کا نوٹس دے دیا۔ (دوسری خبر)

"یہ کالج تو ہم آزمائشی طور پر چلا رہے تھے لیکن اب چونکہ ہمارا پڑتا نہیں کھاتا۔ لہٰذا ہم اسے بند کر رہے ہیں" کالج کی انتظامیہ نے کامرس سیکشن کو بند کرنے کی ظاہری وجہ "یہ بتائی ہے کہ شعبۂ تجارت سے انتظامیہ کو ہر سال دس ہزار روپے کی "خطیر رقم" کا نقصان ہوتا ہے سمجھے صاحب! درس و تدریس کا ادارہ کالج بھی کوئی ہوٹل، کپڑے یا پنساری کی دوکان یا کوئی کاروباری ادارہ تھا جسے آٹھ سال (۱۹۶۳ء) سے آزمائشی طور پر چلایا جا رہا تھا۔ اور اب دس ہزار روپے سالانہ گھاٹے کی صورت میں بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

آدم جی سائنس کالج کی گورننگ باڈی کے اس فیصلے سے سات اساتذہ اور ڈیڑھ سو طلبا فوری طور پر متاثر ہوں گے۔

اس ناگہانی آفت سے چھٹکارا پانے کے لئے کالج کے اساتذہ نے مغربی پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن (مرکز) کے صدر مسٹر رشید پٹیل اور دیگر عہدیداروں سے رابطہ قائم کر کے انہیں صحیح حالات اور حقیقت سے آگاہ کیا اور درخواست کی کہ ان کے کیس کو تعلیمی حکام کے سامنے پیش کیا جائے۔

چنانچہ جناب رشید پٹیل کی قیادت میں ایسوسی ایشن کے ایک وفد نے ناظم تعلیمات کراچی جناب رضی الرحمٰن، وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور سیکرٹری تعلیم حکومت سندھ کیپٹن عثمان علی علیانی سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کر کے انہیں حالات کی سنگین نوعیت سے آگاہ کیا۔

اساتذہ کے وفد نے تعلیمی حکام پر یہ بات واضح کر دی کہ مغربی پاکستان پرائیویٹ کالجز ٹیچرز آرڈیننس کے تحت کسی کالج کی گورننگ باڈی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ کالج کے بند کرنے کا فیصلہ کرے تعلیمی حکام کو یہ بھی بتایا گیا کہ کالج کو بند کرنے کے لئے مالی نقصان کی جو ظاہری وجہ بتائی گئی ہے۔ وہ سراسر غلط ہے۔

کالج کی گورننگ باڈی کے چیئرمین مسٹر عبدالستار پاریکھ نے کالج "کامرس سیکشن" کو بند کرنے کی تجویز پیش کی اس اجلاس کے ایجنڈے میں یہ آئٹم شامل نہیں تھی۔ نیز گورننگ باڈی کے اجلاس میں اساتذہ کے نمائندہ کو اپنا استدلال پیش کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔

ناظم تعلیمات کراچی، سیکرٹری تعلیم حکومت سندھ اور شیخ الجامعہ کراچی نے مغربی پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر رشید پٹیل اور آدم جی کامرس کالج کے اساتذہ کو یقین دلایا کہ وہ کالج کی انتظامیہ کو یک طرفہ فیصلہ کرنے اور مغربی پاکستان پرائیویٹ کالجز ٹیچرز آرڈیننس کی خلاف ورزی کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

باخبر حلقوں نے بتایا ہے کہ آدم جی سائنس کالج کے "کامرس سیکشن" کو بند کرانے کی کوشش میں "چند مفاد پرست" لوگوں کا ہاتھ ہے۔

ان حلقوں کے مطابق یہ عناصر مسٹر عبدالستار منگھانی (جو کالج کی گورننگ باڈی کے رکن ہیں اور اس ادارے میں ایک کلرک کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے) کی قیادت میں کالج کے آڈیٹوریم کو کل وقتی طور پر کرائے پر اٹھانے کے خواہاں ہیں لیکن چونکہ کامرس سیکشن کی شام کی کلاسوں اور ہال کرائے پر دینے کے اوقات یکساں ہیں لہٰذا "کامرس سیکشن" کو بند کئے بغیر ان کی امید بر نہیں آتی۔

آدم جی سائنس کالج آڈیٹوریم کو کرائے پر حاصل کرنے والے اداروں کو موسیقی اور دیگر کھیلوں کی "ریہرسل" اور "ریاض" کے لئے مزید کمروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کالج کے کمروں میں پڑھائی ہو رہی ہو تو یہ کام پورا نہیں ہو سکتا۔

ہال آدم جی سائنس کالج آڈیٹوریم چونکہ شہر کا واحد جدید ترین ہے۔ لہٰذا اسے بک کرانے کے لئے کراچی کے تقریباً تمام ادارے سرگرداں رہتے ہیں جبکہ ہال کے روزانہ کرائے (ساڑھے پانچ سو روپے) کے علاوہ منتظمین (جن میں جناب ستار منگھانی سرفہرست ہیں) "کوڈ" چھنا دینے کے لئے بھی تیار رہتے ہیں۔

ان حلقوں نے بتایا کہ آدم جی سائنس کالج کے سائنس سیکشن سے کالج کی انتظامیہ کو ایک تخمینے کے مطابق ہر سال تقریباً دو لاکھ روپے کا نقصان ہوتا ہے لہٰذا صرف دس ہزار روپے سالانہ نقصان کے لئے مسٹر آدم جی حاجی داؤد جیسی عظیم ہستی کے نام پر قائم کردہ "کامرس سیکشن" کو بند کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

اس بات کو تعلیمی حکام کے اس انکشاف سے تقویت پہنچتی ہے کہ آدم جی سائنس کالج میں "کامرس سیکشن" شروع کرنے کے لئے کالج کی انتظامیہ نے جب ان سے رابطہ قائم کیا تھا تو کالج کی انتظامیہ سے کہا گیا تھا کہ وہ سائنس کالج میں "کامرس سیکشن" کیوں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر انتظامیہ کے ایک نمائندے نے استدلال پیش کیا تھا کہ ہم "تاجر برادری" سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ہمارے کالج میں سیکشن قائم کیا جانا انتہائی ضروری ہے

کالج کی انتظامیہ کا یہ استدلال بھی انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ کالج کو آزمائشی طور پر چلایا جا رہا تھا۔ بھلا وہ کون سا قانون یا قوانین ہیں۔ جن کے تحت اسکول اور کالج بھی جو شخص یا ادارہ چاہے قائم کرے اور پھر اپنی مرضی سے بند کر کے سینکڑوں افراد کو تعلیم اور روزگار سے محروم کر دے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کالج کی انتظامیہ نے تعلیمی حکام سے کیا کوئی خفیہ اجازت لے رکھی ہے ؟

تعلیمی حکام کی بار بار یقین دہانیوں اور بیانات کے باوجود کہ آدم جی سائنس کالج کے "کامرس سیکشن" کو یک طرفہ فیصلہ کے تحت بند کرنے نہیں دیا جائیگا کالج کی گورننگ باڈی اپنے فیصلے پر سختی سے قائم ہے گورننگ باڈی کے سازشی ارکان نے اب نیا حربہ استعمال کیا ہے اور آدم جی سائنس کالج کے اٹھائیس

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں



نیشنل شپنگ کارپوریشن
پاکستان کی
خود اعتمادی کا مظہر...

پوری قوم آج اپنی آزادی کی ۲۴ ویں سالگرہ منارہی ہے

نیشنل شپنگ کارپوریشن اپنے ۳۲ مال بردار جہازوں کے بیڑے
کے ذریعہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں قومی تجارت کو فروغ دینے میں نمایاں
کردار ادا کررہی ہے۔ جو کہ پاکستان کے خود کفیل بننے کی طرف
ایک اہم قدم ہے

آج ہم قومی تعمیر نو اور خود کفالت کے عظیم مقاصد کے حصول
کے لئے اپنی جدوجہد کو تیز سے تیز تر کرنے کا عہد دہراتے ہیں



نیشنل شپنگ کارپوریشن
پاکستان کا عظیم جہاز راں ادارہ

United NSC14/8/71

سرحد کو مسلم لیگ نے خان عبدالقیوم خان عطا کیے : صفحہ ۱۰ سے آگے

لیکن گورنر نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اب یہ قیوم خاں کی خوش نصیبی تھی کہ جنوری ۴۸ء میں اسمبلی کے حزب مخالف کے سات ارکان مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس طرح مارچ ۱۹۴۸ء میں موصوف بجٹ پاس کرانے میں کامیاب ہوئے۔ پھر موصوف نے سرخپوشوں پر توجہ دی۔ غفار خاں اور ڈاکٹر خانصاحب سرحد میں مقبول تھے۔ اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لئے انہوں نے دونوں کو گرفتار کر لیا۔ اور بابڑہ میں جلیانوالہ باغ کی تاریخ دہرائی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں خان قیوم نے غفار خاں کے قدموں میں سر رکھ کر بابڑہ فائرنگ کی تمام ذمے داری مرکزی حکومت پر ڈالدی۔

صوبوں کے یہ لیل و نہار تھے۔ لیکن مرکز میں بھی ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ لیاقت علی خاں مسلم لیگ کی تنظیم نو میں مصروف تھے۔ کاروبار حکومت چیف سکرٹری چوہدری محمد علی کے ہاتھوں میں تھا جو نوکر شاہی کے کل پرزے تھے۔ نوکر شاہی کو ان کی بدولت اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے میں بہت مدد ملی۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے بابائے قوم کو آئین بنانے کی مہلت نہ دی۔ خان لیاقت علی خاں مسلم لیگ کے سرکردہ رہنماؤں کے گٹھ جوڑ اور محلاتی سازشوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے پاکستان کو کوئی دستور نہیں دے سکے۔ انہوں نے صرف قرارداد مقاصد پیش کی۔ اس قرارداد کو بھی پاس کروانے میں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسمبلی میں ایک گروہ جس کی قیادت غلام محمد مرحوم کے پاس تھی۔ لادینی ریاست کا حامی تھا جبکہ مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے ہمنوا مذہبی ریاست کے قرارداد مقاصد پر بحث کے دوران ہی لیاقت علی خاں کو احساس ہو گیا کہ ملک کا آئین پاس کروانا کوئی مذاق نہیں ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے آئین

لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد غلام محمد مرحوم نے وزیر اعظم بننے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں مری میں غلام محمد اور مشتاق احمد گورمانی کی بات چیت بھی ہوئی۔ لیکن خواجہ ناظم الدین اس سے اتفاق نہ کرتے ہوئے گورنر جنرلی کو چھوڑ کر وزیر اعظم بن گئے۔ اور غلام محمد کو گورنر جنرل بنا دیا گیا — ان کے بعد نورالامین مشرقی پاکستان کے وزیر اعلےٰ

تھے۔ ۵۲-۱۹۵۱ء کے موسم سرما میں نمک کے اجارہ داروں نے مشرقی صوبے میں نمک کی مصنوعی قلت پیدا کر دی صوبائی حکومت نے کھل کر نمک کے اجارہ داروں کا ساتھ دیا۔ اس کے علاوہ ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کو لسانی تحریک کے حامی طلبہ پر فائرنگ کروا کر نورالامین نے عوام کو مسلم لیگ سے بددل کر دیا۔ ادھر پنجاب میں تحریک ختم نبوت شروع ہوئی۔ مشرقی پاکستان اور پنجاب کے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غلام محمد گورنر جنرل نے اپنے اختیارات میں بے حد اضافہ کر لیا۔ اور وزیر اعظم کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔

ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا حالانکہ اسمبلی میں ان کے حامیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ لیکن اسمبلی کے مسلم لیگی اراکین کو اس بات کی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ گورنر جنرل کے اس آمرانہ فیصلہ کے خلاف احتجاج ہی کرتے۔ بلکہ انہوں نے امریکہ سے درآمد شدہ وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کا خیر مقدم لیا۔ اُسے اپنا لیڈر تسلیم کیا۔ اسمبلی میں اس سے تعاون کیا۔ اور مسلم لیگ کا صدر بھی بنا دیا۔ اس جمہوریت کش اقدام پر ارکان اسمبلی کی خاموشی اور آمرانہ حکم پر سر جھکانے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ گورنر جنرل کی ہمت اور بڑھ گئی اور جب اسمبلی نے گورنر جنرل کے اختیارات کم کرنے چاہے تو اس نے دستور ساز اسمبلی ہی کو توڑ دیا۔ مولوی تمیز الدین نے اس پر عدالت سے رجوع کیا۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت —

مارچ ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں انتخابات ہونے والے تھے۔ مسلم لیگ کی شکست یقینی تھی۔ نورالامین سے عوام نفرت کرتے تھے۔ عوامی لیگ اور کرشک سرامک پارٹی نے متحدہ محاذ بنا لیا تھا۔ جگتو فرنٹ میں حسین شہید سہروردی، مولوی فضل الحق اور مولانا بھاشانی جیسے بلند پایہ رہنما تھے۔ چنانچہ نورالامین کی مدد کے لئے غلام محمد نے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کو ڈھاکے بھیجا۔ لیکن وہ ڈھاکے میں جلسہ بھی نہ کر سکے — حکومت کی تمام کوششوں کے باوجود نورالامین ایک طالب علم کے

مقابلے میں ہار گئے۔ مسلم لیگ بمشکل دس نشستیں حاصل کر سکی۔ مولوی فضل الحق مشرقی پاکستان کے وزیر اعلےٰ بنے۔ لیکن دو ماہ کے بعد ہی انہیں "غدار" اور "ملک دشمن" قرار دے کر وزارت سے برطرف کر دیا گیا اور صوبے میں گورنر راج قائم ہو گیا

محمد علی بوگرہ جس طرح امریکہ سے درآمد ہوئے اسی طرح انہیں امریکہ برآمد کر دیا گیا۔ اور وزارت اعظےٰ کا منصب چوہدری محمد علی کے حصے میں آیا۔ جو دراصل ان خدمات کا صلہ تھا جو انہوں نے اسکندر مرزا کو گورنر جنرل بنانے کے سلسلے میں ادا کی تھیں۔ چوہدری محمد علی نے اتنا کرم کیا کہ مسلم لیگ کی صدارت خود نہیں سنبھالی بلکہ وہ سردار عبدالرب نشتر کے سپرد کر دی چوہدری صاحب وزیر اعظم بنے تو مجید لاہوری نے لکھا "پولیٹکس خلاص، ایڈمنسٹریشن چالو" اور نہرو نے تبصرہ کیا "گورنمنٹ آف دی بابوز" کیونکہ گورنر جنرل اور وزیر اعظم دونوں نوکر شاہی کے افراد تھے مسلم لیگ کے اس چوہدری وزیر اعظم نے پاکستان کی قومی غیرت تک فروخت کر دی بھارت نے پاکستان کے سرحدی گاؤں میں رات کی تاریکی میں حملہ کیا۔ دیہاتیوں کو ہلاک اور املاک کو تباہ و برباد کیا پاکستانی حکومت نے "احتجاج" تک نہیں کیا۔ بلکہ بھارتی وزیر اعظم نہرو کی خدمت میں ایک لاکھ روپے کا چیک پیش کیا گویا وہ محب وطن پاکستانیوں کو شہید کرنے کا معاوضہ ادا کیا گیا — چوہدری صاحب نے ۱۹۵۶ء کا آئین بنایا۔ لیکن یہ دستور سے زیادہ سمجھوتے بازی کا مرکب ہے۔ ایک جانب مشرقی پاکستان سے سودے بازی کی گئی۔ اور دوسری طرف اسکندر مرزا کو پہلا صدر بنانے اور زیادہ اختیارات دینے کا وعدہ کیا گیا۔ ورنہ خدشہ تھا کہ وہ دستور ساز اسمبلی بھی توڑ دیں گے۔

چوہدری محمد علی کے بعد حسین شہید سہروردی وزیر اعظم بنے یہ پاکستان کے پہلے غیر مسلم لیگی وزیر اعظم تھے انہوں نے ری پبلکن پارٹی کے اشتراک سے حکومت بنائی جب اسکندر مرزا اور سہروردی میں اختلاف ہوا تو اسکندر مرزا کی جماعت ری پبلکن نے سہروردی کی حمایت سے دست برداری کا فیصلہ کیا۔ ممتاز دولتانہ کو اس فیصلہ کی خبر ہوئی تو انہوں نے سہروردی کو اسمبلی میں مسلم لیگ کے تعاون کا یقین دلایا۔ اور ایک خفیہ مراسلہ مسلم لیگی ارکان اسمبلی کو بھیجا۔ جس میں سہروردی



سے تعاون کی ہدایت کی گئی تھی اس تعاون اور حمایت کے بل بوتے پر سہروردی اور اکڑ گئے۔ ایک رات اسکندر مرزا نے انہیں ایوان صدر میں بلایا اور استعفے کا مطالبہ کیا۔ اس پر سہروردی نے کہا "صبح اسمبلی کا اجلاس بلوایئے اگر مجھ پر عدم اعتماد کا ووٹ پاس ہو جاتا ہے تو میں مستعفی ہو جاؤں گا" لیکن اسکندر مرزا اس پر راضی نہ ہوئے اور انہیں برطرف کرنے کی دھمکی دی۔ چنانچہ سہروردی نے وزارت اعظمی سے استعفے دے دیا لیکن اگلی صبح ان کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب اسکندر مرزا نے مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت دی اور وہ اس نے فوراً قبول کر لی۔ آئی۔ آئی چندریگر وزیر اعظم بنے اور ممتاز دولتانہ وزیر دفاع۔ یہ وزارت دو ماہ بھی نہ چل سکی لیکن اس مختصر سے عرصے میں اس نے دنیائے صحافت پر کاری ضرب لگائی "حریت" کا ڈکلیریشن منسوخ کر دیا۔

آئی۔ آئی چندریگر کی وزارت اعظمی مسلم لیگ کی آخری وزارت تھی۔ اس کے بعد ری پبلکن کے فیروز خان وزیر اعظم بنے۔ پھر ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء لگا سیاسی آزادیاں سلب کر لی گئیں۔ دولتانہ ایبڈو کئے گئے قیوم خان نے ایوب خان کے آگے ہاتھ جوڑ لئے اور معافی نامہ میں سیاست سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

سیاست پر سے پابندی ختم ہونے کے بعد ایوب خان کو ایک سیاسی جماعت کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے مسلم لیگیوں کا اجلاس کراچی میں بلوایا۔ اس میں بڑے بڑے پرانے مسلم لیگیوں نے شرکت کی چوہدری خلیق الزماں بھی شریک ہوئے ممتاز دولتانہ اگرچہ ایبڈو ہو چکے تھے لیکن انہوں نے بھی مسلم لیگیوں کو اجلاس میں شرکت کے لئے مجبور کیا۔ تاکہ ایوب خان کی ہمدردی حاصل کی جائے۔ چنانچہ اس اجلاس میں کنونشن مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا۔ اور پاکستان مسلم لیگ کنونشن لیگ اور کونسل لیگ میں تقسیم ہو گئی کنونشن مسلم لیگ مارچ ۱۹۶۹ء تک برسر اقتدار رہی یہ پورا دور پاکستان کی تاریخ کا سیاہ ترین دور ہے۔ اس کے دور حکومت میں اعلان تاشقند جیسا رسوائے زمانہ معاہدہ کیا گیا مسئلہ کشمیر کو سرد خانے میں ڈال دیا گیا غرض وہ کون سا ظلم اور استحصال ہے جو ملک اور قوم کے ساتھ نہیں کیا گیا۔

ایوب خان نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے گول میز کانفرنس بلوائی تو کونسل مسلم لیگ فوراً شرکت کے لئے پہنچ گئی قیوم خان بھی گمنامی کے پردے سے نکل آئے اور اقتدار کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے مارچ ۱۹۶۹ء میں مارشل لاء لگا تو تمام مسلم لیگی کونے میں دبک گئے۔ عوام سے لاتعلق رہے۔ موجودہ مارشل لاء کے دور میں قیوم خان بھی اپنے گوشہ سے باہر نکل آئے اور انہوں نے قائد اعظم مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی۔ اور کہا "یہ اصل مسلم لیگ ہے"۔ انتخابات سے کچھ عرصہ پہلے مظفر علی قزلباش وزیر خزانہ کے اشارے پر تینوں مسلم لیگوں کے اتحاد کی بات چلی۔ لیکن لیڈروں کے مسئلے کی بنا پر معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ البتہ کنونشن لیگ کے کچھ لوگ قیوم مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور آل پاکستان مسلم لیگ بن گئی۔ بات اس سے آگے نہ بڑھی۔ انتخابات میں عوام نے تینوں مسلم لیگوں کو مسترد کر دیا اور انہیں ۸ سے زیادہ سیٹیں نہ ملیں۔ جب بھٹو مجیب بات چیت ہوئی تو انہوں نے مجیب کی حمایت کی مگر وہاں بھی تاریخ نے انہیں مسترد کر دیا۔ اور اب جب عوامی لیگ کالعدم ہو گئی۔ مشرقی پاکستان میں سیٹیں خالی ہونے کے امکانات دکھائی دیئے تو پھر خفیہ ہاتھ سے انہیں اکثریتی پارٹی بنانے کے لئے متحد کرنے کے لئے ڈوری ہلانی شروع کی ڈوری ہل رہی ہے۔ فضل القادر چوہدری اور دولتانہ ایک ہو گئے۔ قیوم خان بھی مائل ہیں۔ آج کل میں کراچی میں مردہ گھوڑے جمع ہو رہے ہیں مقصد یہ ہے کہ عوام کو اقتدار میں حصہ نہ مل سکے گھسا پٹا نظام جاری رہے۔ جاگیردار، سرمایہ دار، مفاد پرست ایک "مسلم لیگ" کا سہارا لے رہے ہیں۔ اس قبر میں جگہ تلاش کر رہے ہیں جس پر "مسلم لیگ" کا کتبہ نصب ہو سکے۔ مگر ۲۴ برس تک مسلم لیگ کے چرکے کھانے والے عوام دوبارہ اپنی موت کے پروانے پر دستخط نہیں کریں گے۔ یہ چراغ آخری بار بھڑک رہا ہے اور ہر چراغ بجھنے سے پہلے بھڑکتا ہے

نوکر شاہی حیدرآباد کے مسائل حل نہیں ہونے دیتی

نمائندہ خصوصی

حیدرآباد مسلسل بڑھ رہا ہے۔ چاروں طرف پھیل رہا ہے اور اس بے ہنگم انداز سے پھیل رہا ہے کہ جیسے اس عمل کے پیچھے ذہن کار فرما نہیں بلکہ نوکر شاہی کا مخصوص روایتی بدنام زمانہ کردار کار فرما ہو۔

حیدرآباد کے سرکاری و نیم سرکاری اداروں کی عوام دشمن سرگرمیوں اور بدعنوانیوں کا "پردہ چاک" کرنے سے پہلے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مرتبہ حیدرآباد کے سیاسی پس منظر کا ایک سرسری سا جائزہ پیش کردوں تاکہ عوام کو حیدرآباد کے سیاسی ماحول اور نشیب و فراز سے آگاہی ہو کسی نے یہ سچ کہا ہے کہ "حیدرآباد کا موسم اور حیدرآباد کی سیاست" کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب سرد سے گرم اور گرم سے سرد ہو جائے۔

پچھلے صدارتی انتخاب میں مغربی پاکستان میں کراچی کے بعد حیدرآباد ہی وہ شہر ہے کہ جہاں ایوب خان کو مادرِ ملت کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ اس کے بعد حالات بدلتے ہیں۔ حالات کے ساتھ سیاست بدلتی ہے۔ نوکر شاہی اپنا پینترا بدلتی ہے۔ حیدرآباد کی ابن الوقت سیاست نے اپنا چولا بدلا۔ نوکر شاہی نے عوامی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے گروہی مفادات کو ہوا دینی شروع کی تاکہ ایوب خاں عوامی تحریک کی ٹکر سہہ سکیں۔ اور پھر۔ اسی حیدرآباد کے در و دیوار نے انہیں زبانوں سے "ایوب زندہ باد" کے نعرے سنے جو زبانیں ایوب خان "ڈاؤن ڈاؤن" کے نعرے لگا چکی تھیں۔ پورے پاکستان میں حیدرآباد وہ واحد اور منفرد شہر ہے جہاں عوامی تحریک کے دنوں میں ایوب خاں کی حمایت میں سب سے پہلے اور سب سے بڑا جلوس نکلا جس میں ایک محتاط اندازے کے مطابق پچیس ہزار افراد نے شرکت کی۔

یہ کیسی تبدیلی تھی؟ تین سال کے عرصہ کے دوران وہ شہر جس نے ایوب خاں کو مادرِ ملت کے مقابلہ میں جیتنے نہ دیا اب پورے پاکستان سے کٹ کر ایسے وقت میں ایوب خاں کی حمایت کر رہا ہے جب کہ پورے ملک میں ایوب خان کی مخالفت عروج پر پہنچ چکی تھی

یہاں سے حیدرآباد کی سیاست ایک بار پھر

سرکاری اور

نیم سرکاری

اداروں میں

بدعنوانیاں

عروج پر ہیں

نوکر شاہی اور طالع آزما اور ابن الوقت سیاستدانوں کے گروہی مفادات کا شکار ہو کر عوامی زندگی سے کٹ جاتی ہے۔ ابن الوقت سیاست والوں نے ہمیشہ اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے عوام کو بیوقوف بنایا اور عوام اپنی سادہ لوحی اور کم علمی کی وجہ سے گروہی سیاست کا شکار ہو گئے۔ موقعہ پرستی کا یہ حال ہے کہ کل تک ایک نام نہاد عوامی حیدر بخا جو ہر جلسہ عام میں سوشلزم کا مطلب یہ بتایا کرتے تھے کہ "سوشلزم کا مطلب ہے انکارِ خدا، انکارِ رسول اور انکارِ آخرت۔" صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں سوڈیڑھ سو ووٹ لینے کے بعد وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور اب شاید ان کے نزدیک سوشلزم کا وہ مطلب نہیں رہا جو پہلے تھا۔

قصہ مختصر حیدرآباد کی سیاست موقع پرستی کا شکار اور دوستی سے انکار کرتی ہوئی ایسی ڈگر پر چلی جا رہی ہے کہ جس ڈگر پر اسے بیس سال قبل ڈالا گیا تھا۔ جب بھی ووٹ لینے کا موسم آیا تو یہی موقعہ پرست غریب بستیوں کے چکر لگاتے ہیں جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔ اسلام پاکستان اور اردو کے واسطے دے کر ووٹ حاصل کر کے اسمبلیوں اور میونسپلٹیوں پر قبضہ جماتے ہیں اور پھر کسی نے سینما، کسی نے پٹرول پمپ اور کسی نے ہوٹل بنوا لیا۔ لیکن غریب بستیوں میں آج بھی اندھیرا ہے اس المیہ سے دوچار یہ غریب محنت کش اپنے سیاسی حقوق سے لاعلم اپنی عددی طاقت سے بے بہرہ آج بھی اس بات کے منتظر ہیں کہ کب تقدیر کا پہیہ گھومتا ہے۔ تقدیر کا پہیہ تو نہیں گھوما لیکن موقعہ پرست سیاست والوں کی کرسیاں ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں اس طرح گھوم رہی ہیں جس طرح ماضی کی گھومتی رہی ہیں۔

اس ظلم اور موقعہ پرستی کی ذمہ داری کس پر عائد کی جا سکتی ہے؟ اس سماجی ڈھانچہ پر کہ جس نے بے رحم موقعہ پرست سیاست والوں اور راشی افسروں کو چھوٹ دے رکھی ہے جو ۲۴ سال سے جونک بن کر غریب عوام کا خون بے دردی سے چوس رہے ہیں۔

حیدر آباد کے سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں عوام دشمن سرگرمیاں اور بدعنوانیاں اپنے عروج پر ہیں۔ عروج پر اس لئے کہ آج تک ان اداروں کا کسی جانب سے یا کسی سطح سے بھی محاسبہ نہیں کیا گیا جبکہ حیدر آباد مغربی پاکستان کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ اور جس کی آبادی سات آٹھ لاکھ سے بھی تجاوز کر رہی ہے لیکن آج تک یہ شہر احتسابی کارروائیوں سے دور جا رہا ہے کہ جیسے اس شہر میں عوام دشمنی اور بدعنوانیوں کا دُور دُور پتہ نہیں۔ احتساب سے دُور رہنے کی دو وجوہ ہیں۔ (۱) گروہی سیاست جس کی وجہ سے ہر بدعنوانی دب جاتی ہے (۲) دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ کراچی کے اخبارات نے کبھی بھی حیدر آباد کے سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں ہونے والی بدعنوانیوں کو پیش نہیں کیا۔ قومی اخبارات سرکاری و نیم سرکاری اخباروں کی مبینہ بدعنوانیوں کا پردہ چاک کرنے میں اہم کردار انجام دیتے ہیں۔ مگر نجانے کیوں اخبارات اور ان کے نمائندے حیدر آباد کے سرکاری اداروں کی دھاندلی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھتے ؟

کیمبل پور

اِس گروہ کی قیادت خوبرو، مہ جبیں حسینہ کر رہی ہے۔

نمائندہ خصوصی

ضلع کیمبل پور کو چند سال پہلے ڈاکو محمد خان نے شہرت کے بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔ لیکن زمانے نے دیکھا کہ ڈاکو محمد خان زخمی حالت میں گرفتار ہوا اور پردہ اُسے شہرت کی بلندی پہنچانے والے سابق وزیر صاحب کو بھی درِ زنداں کی زیارت کرنی پڑی۔ اس سے ضلع کیمبل پور میں سماج دشمن عناصر سہم گئے مگر گذشتہ چند ماہ سے تحصیل فتح جنگ کے کالا چٹا پہاڑ کو ڈاکوؤں کے ایک منظم گروہ نے مسکن بنا رکھا ہے۔ اس گروہ کی قیادت ایک خوبرو، مہ جبین حسینہ کر رہی ہے۔ ان میں ایک مفرور قیدی بھی شامل ہے جو تھانہ فتح جنگ کے موقع کریاں کا بیان کیا جاتا ہے۔ وہ ایک قتل کے سلسلے میں سزا بھگتنے کے دوران لاہور سے فرار ہو گیا۔ اس کی علاقے میں آمد کے بعد اس کا ایک سوتیلا بھائی اچانک لاپتہ ہو گیا اور آج تک اس کا نشان کہیں نہ ملا۔ گاؤں کے لوگوں نے مبینہ مفرور کی طرف سے قتل کر دیئے جانے کے متعلق تھانے میں اطلاع دی۔ پولیس نے کاغذی کارروائی تو کر دی ہو گی گئی۔ مگر جن لوگوں نے گمشدگی کی اطلاع تھانے میں پہنچائی ان کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ اس کے بعد اس نوجوان نے اپنا گروہ تیار کر کے کالا چٹا پہاڑ کو مسکن بنا لیا اور راہگیروں کو لوٹنے اور عورتوں سے ناقابل بیان سلوک کرنا شروع کر دیا۔ ایک محتاط اندازے تک ڈاکوؤں کا یہ منظم گروہ جو اپنے آپ کو ڈاکو محمد خان کا جانشین کہلواتا

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمایئے

ملک کی پیداوار بڑھانا، برآمدات میں اضافہ کرنا، زندگی کے مختلف شعبوں میں بچت کرنا ہر ایک پاکستانی کا قومی فریضہ ہے

*

پاکستان کا حصول اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہوا ہے۔ لہٰذا خداوندِ کریم کی ذات پر ہم سب کو بھروسہ رکھنا چاہیئے اور مسلسل جدوجہد کرنی چاہیئے

* *

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پردم اگر ہے تو، تو نہیں خطرۂ اُفتاد

ہم کو اپنے آپ اور اپنے عوام پر اعتماد اور اپنے وسائل پر انحصار رکھنا چاہیئے
غیر ملکی اِمداد پر ہمیشہ کے لئے انحصار کرنا دانشمندی نہیں ہے

* * *

ترا نادان اُمّید غمگساری ہا ز افرنگ است
دلِ شاہیں نہ سوزد بہر آن مرغے کہ در چنگ است

* * * *

پشیمان شو اگر لعلی ز ارثِ پدر خواہی
کجا عیشی بیرون آوردن لعلی کہ در سنگ است

اللہ تعالیٰ اُن کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں

مُلک کا ایک خادم

بقیہ :- ہنزہ سے چاٹگام تک

ہے اب تک ہزاروں راہگیروں سے لاکھوں روپے ہتھیا چکا ہے۔ فتح جنگ میں تحصیل ہیڈ کوارٹر تھانہ سول ہسپتال، تار گھر، منڈی مویشیاں اور تجارتی منڈی اور قریبی قصبہ ہے۔ اس لئے سینکڑوں افراد روزانہ اس جنگل سے گذر کر جاتے ہیں بعض اطلاعات کے مطابق یہ گروہ جدید اور آتشیں اسلحہ سے لیس ہے اور علاقے کے سماج دشمن عناصر کی عملی حمایت حاصل ہے اور وہ ان سے اسلحہ اور دیگر سہولتیں حاصل کرتے ہیں افسوس کا مقام یہ ہے کہ مقامی پولیس ان ڈاکوؤں پر جو کسی طرح تعداد میں ایک درجن سے زیادہ نہیں ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر رہی ، سنا ہے ایک دفعہ ایک چھاپہ مار پارٹی جنگل کی طرف روانہ ہوئی اور قریبی برساتی نالہ کے کنارے کھانا کھا کر واپس آگئی۔ اس علاقے میں ان ڈاکوؤں کا وجود قانون کے محافظوں کے لئے کھلا چیلنج ہے۔

ملہال مغلاں کے مسائل پر توجہ دی جائے

ملہال مغلاں ضلع جہلم کے عوام خشک سالی کے سبب پریشان تھے۔ اگر بارش نہ ہوتی تو فصلوں کو شدید نقصان پہنچتا۔ اور اس کے بعد بے پناہ مسائل عوام کو گھیر لیتے۔ لیکن شاید قدرت کو رحم آگیا اور خوب بارش ہوئی۔ چند دن پہلے جن کے چہرے کملائے ہوئے تھے بارش ہونے سے کھل اٹھے۔ ملہال مغلاں کے باشندوں کو اس کے علاوہ بھی انگنت مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا ہے۔ اگر انتظامیہ حسب ذیل مسائل پر فوری توجہ دے تو یہاں کے لوگوں کے مسائل آدھے رہ جائیں گے۔

۱- ڈسپنسری میں ادویات اور ڈاکٹر کی سہولت مہیا کی جائے۔
۲- ملہال مغلاں - ڈھڈیال سڑک کو پختہ کیا جائے۔
۳- ہائی اسکول میں عملہ کی کمی کی شکایت دور کی جائے۔
۴- ملہال مغلاں - دو تالہ سڑک کو پختہ کیا جائے۔
۵ ملہال مغلاں - سوہاوہ روڈ پر بجلی مہیا کی جائے۔
۶- ملہال مغلاں میں ٹیلی فون ایکس چینج کا انتظام کیا جائے۔

بقیہ : کراچی کی مصیبتیں

اساتذہ (جو کامرس سیکشن بند کرنے کے مخالف ہیں) سے کہا گیا ہے کہ اگر وہ اپنے موقف پر اڑے رہے تو کالج کی انتظامیہ آرڈیننس کے تحت سائنس کالج کے اخراجات کی پچیس فی صد رقم دے کر علیحدہ ہو جائے یہ چال اس لئے چلی گئی ہے کہ "کامرس سیکشن" کے اساتذہ کو علیحدہ (ISOLATE) کر دیا جائے اور اس طرح وہ اپنے ساتھی اساتذہ کی حمایت سے محروم ہو جائیں۔

"کامرس" سیکشن کے اساتذہ کی بدقسمتی سے کالج کے بزرگ استاد اور ستر سالہ پرنسپل مسٹر ایل کے شیخ اور بعض دوسرے بزرگ اساتذہ بھی انتظامیہ کے موقف کی حمایت کر رہے ہیں اور کیوں نہ کریں کہ جناب شیخ اور یہ اساتذہ انتظامیہ کے رحم و کرم پر ان عہدوں پر فائز ہیں ورنہ دوسری صورت میں وہ کبھی کے ریٹائر کئے جا چکے ہوتے۔

"کامرس سیکشن" کے مظلوم اساتذہ کی حمایت کرنے کیلئے بجائے جناب شیخ یہ کہتے ہیں کہ میں تو کالج کی انتظامیہ جو بھی فیصلہ کرے گی۔ اس پر چوں چرا کئے بغیر عمل درآمد کروں گا۔

دیکھا صاحب! سرمایہ دار معاشرے کا تاریک ترین پہلو! ایک شخص جس نے نصف صدی سے زائد مدت تک درس و تدریس کے ذریعے خدمات انجام دی ہوں اب زندگی کے آخری ایام میں ایک ایسے اقدام میں مددگار بنے جس کے تحت سینکڑوں طلبا کو تعلیم دینے پر انکار یوں کو بچوانے اور بھانڈوں کو گوانے کو ترجیح دی جائے، یہ رجعت پسندی اور مفاد پرستی کی انتہا نہیں تو کیا ہے۔

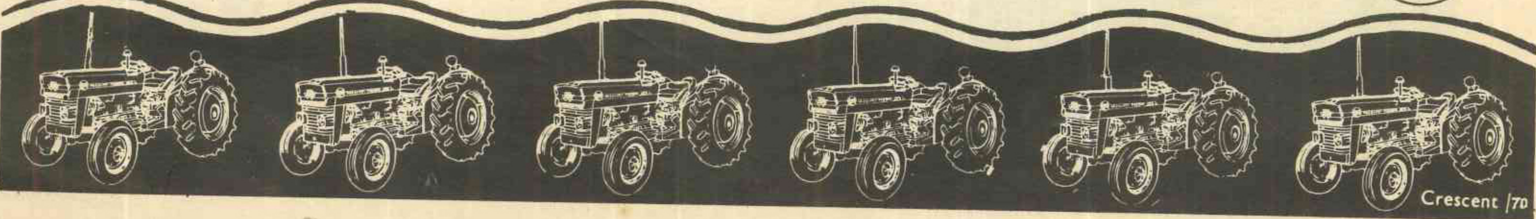
مرحوم سر آدم جی حاجی داؤد کی تعلیمی خدمات سے کیسے انکار ہو سکتا ہے اپنے وطن جیتپور میں ہائی اسکول اور اسپتال قائم کرنے، کاٹھیاواڑ کے صدر مقام راجکوٹ میں ایک عظیم آغا خانی اسکول و کالج کے قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے اور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کو اپنی استعداد کے مطابق امداد دینے کے حقائق کو کوئی ذی شعور جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ان کے قائم کردہ ادارے "میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی" سے امداد حاصل کر کے مختلف علوم و فنون و دیگر شعبوں میں فارغ التحصیل ہونے والے ہزاروں افراد آج کل پاکستان کے مختلف اداروں میں کلیدی عہدوں پر فائز ہیں۔ ان افراد میں سے چند لوگ اگر یہ چاہیں تو وہ اپنی معمولی سی سعی سے اس ہستی کے نام پر قائم کئے جانے والے ادارے آدم جی کامرس کالج کو بند ہونے سے روک سکتے ہیں اور کالج کی انتظامیہ کی طرف سے پیش کئے جانے والے "دس ہزار روپے کے نقصان" کے "عذر لنگ" کا جواب دے سکتے ہیں۔

بقیہ: روزنامہ غالب سے روزنامہ جنگ تک

چلے گئے تھے ہارون سعد خواتین اور بچوں کے مضمون کے انچارج کی حیثیت سے اور حید رخاں سینیئر سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کے علاوہ عباس جلیلی کے داماد جعفر نقوی بھی کراچی امروز میں رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اور پاکستان ٹائمز لاہور کو بھی خبریں بھیجتے تھے اور بچوں کے صفحے کے انچارج بھی ابو مجتبیٰ کے نام سے نوعمر لکھنے والوں میں مقبول تھے ان کا انتقال امروز کے سرکاری قبضہ میں جانے سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ یہ سب باصلاحیت اور تعلیم یافتہ کھلے ذہن اور کشادہ دل لوگ تھے۔ مگر ان کی صلاحیتوں سے جو کام لیا جانا چاہیئے تھا وہ نہیں لیا گیا۔ اور اخبار کی صحیح منصوبہ بندی کی طرف توجہ نہ دی جا سکی۔ ایک وجہ اس کے زوال کی یہ بھی تھی انجام اور جنگ میں دو ایک کے سوا نسبتاً نئے لوگ تھے مگر ان کی صلاحیتوں سے خوب کام لیا جا رہا تھا۔ اس لئے یہ دونوں اخبار چمک رہے تھے۔ امروز کے مقابلہ میں جنگ اور انجام کے زیادہ چلنے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ کراچی کی مہاجر آبادی ان اخباروں سے جذباتی وابستگی رکھتی تھی اور ان کو اپنی زندگی کا لازمہ سمجھتی تھی۔ اس کے نزدیک ان اخباروں میں چھپا ہوا ہر لفظ معتبر تھا دلی اور یوپی کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کے مزاجوں کو یہ اخبار سمجھنے بھی تھے۔ اس لئے وہی کچھ پڑھنے کو دیتے تھے جو یہ لوگ چاہتے تھے۔ امروز میں علم و دانش صحت زبان صحیح ترجمے اور غیر جانبدارانہ سرخیوں پر توجہ دی جاتی تھی جنگ انجام کی طرح سرخیاں سنسنی خیز اور خبر کے متن سے مختلف نہیں ہوتی تھیں۔ خبروں میں تبصرہ کا رنگ نہیں جھلکتا تھا۔ یہ انداز صحافت لاہور میں تو مقبول ہو گیا مگر کراچی میں نہ چل سکا اس لئے کہ کراچی کے ان دو پرانے اخباروں نے کچھ اور ہی ڈھنگ سے اپنی اشاعت کی راہ ہموار کی تھی۔

(باقی آئندہ)





MASSEY-FERGUSON

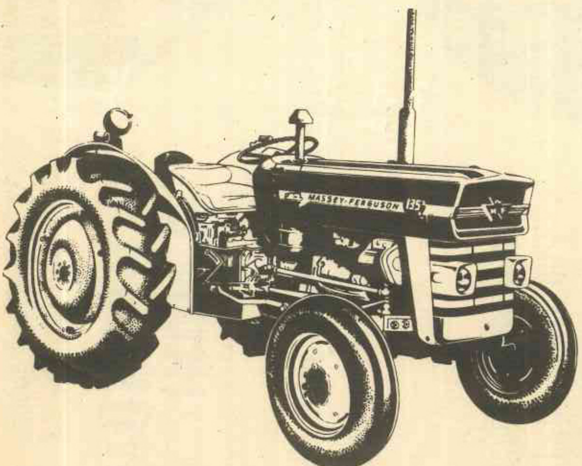
دُنیا بھر میں سب سے اعلےٰ
میسیٔ فرگوسنٔ ٹریکٹر

کپاس، گنّا، گندم، چاول، اور دیگر اجناس کی کاشت کے لئے میسیٔ فرگوسنٔ ٹریکٹر کے ساتھ ہمہ قسم ہل اور آلات بھی حسبِ ضرورت دستیاب ہیں۔ جو مختلف زمینوں، موسموں اور مقامی زرعی ضرورتوں کے لئے دنیا بھر میں مفید اور پائیدار ثابت ہو چکے ہیں۔

خصوصی مراعات اور فوائد جو میسیٔ فرگوسن کو حاصل ھیں:

• گشتی ورکشاپ کے ذریعے بر موقع مرمت • وافر پُرزہ جات باافراط • خدمت کیلئے ڈیلران ہر جگہ موجود:

واحد تقسیم کنندگان: رانا ٹریکٹرز اینڈ ایکوپمنٹ لمیٹڈ۔ شیخوپورہ روڈ۔ لاھور



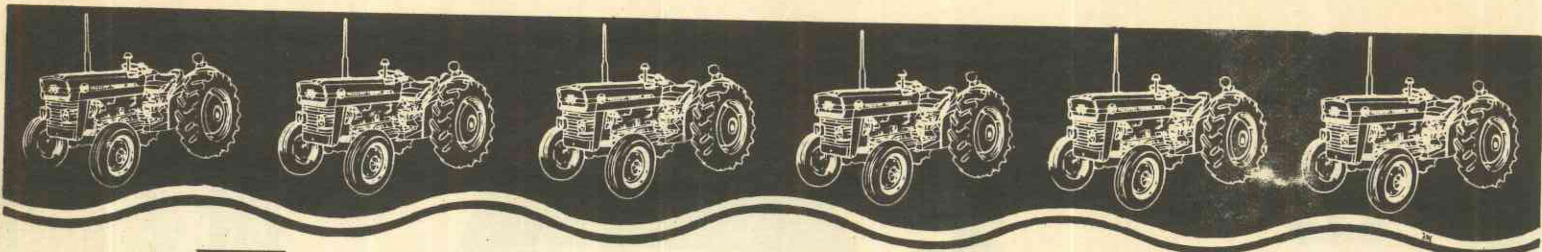
جہاں زرعی ترقی وہاں میسیٔ فرگوسنٔ

FOR DETAILS PLEASE CONTACT Sole Distributors:

Rana Tractors & Equipment Ltd.

Sheikhupura Road, (P.O. Box No. 1147) Lahore.





Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
12—19 AUGUST, 1971